نالۂ مشیر

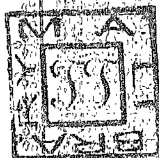
یعنی

مجموعہ اولی اشعار احمد مشیر حسین قدوائی بیرسٹر ایٹ لا

گدیہ۔ بارہ بنکی۔ اودھ

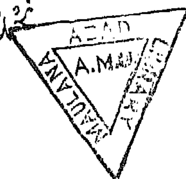
باہتمام عبد العلی خاں

مطبع جامعہ ملیہ علی گڈھ میں طبع ہوا



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

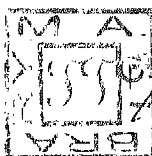
نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم



مقدمہ

یہ دیوان یا مجموعۂ نظم تفریح دل کے لیے کشمیر میں مرتب ہوا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک نالہ تھا جو یادِ گلگشت کشمیر کی جنون خیز ہوا کے اثر سے بے ساختہ مشتہیر کے لب تک آگیا۔

اس لیے بطور مقدمہ میں وہ خط درج کرتا ہوں جو دوسری بار کشمیر جانے پر میں نے اپنے عزیز اسحاق علی صاحب کاکوروی معروف بہ ظفر الملک اڈیٹر الناظر کو لکھا تھا اور جو انھوں نے اپنے قیمتی رسالہ میں شایع کر دیا تھا۔



کشمیر کا حال وہاں کی آب و ہوا کا اثر جو میرے دل و دماغ پر ہوتا تھا۔ میری شاعری کی ابتدا کس طرح ہوئی۔ یہ سب اُس خط میں مفصل بیان ہو گیا ہے

جو چھ غزلیں اس خط کے ساتھ بھیجی گئی تھیں ان میں بعد کو میں نے حسب عادت ترمیم کی اور دیگر نظموں کے ساتھ اُستاد وقت نانا شیخ احمد علی قدوائی صاحب المتخلص بہ **شوق** نے اُن پر اصلاح بھی دی۔

وہ دیوان ہی میں اپنے موقع سے درج ہوئی ہیں خط سے نکال ڈالی گئیں

ستمبر ۱۹۱۳ء میں سری نگر کشمیر میں ایک نظم غزل ہی کی طرح ردیف و قافیہ کے التزام سے تین سو اشعار سے زیادہ کی "فلسفۂ محبت" کے عنوان سے ہوئی تھی۔ مطلع یہ تھا:-

محبت محبت محبت تو کیا ہے محبت زدہ دل یہی پوچھتا ہے

ابھی اس نظم کے اردو میں شایع ہونے کی نوبت تو نہیں آئی
وقتِ فرصت علیحدہ شایع ہوگی لیکن اس کا انگریزی ترجمہ چھپکر
مختلف ملکوں میں پھیلا اور از حد مقبول ہوا۔ پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا
ہے میں نے اپنی انگریزی کی اور کتابوں کی طرح اس کو بھی
چھپوا کر اشاعت اسلام ووکنگ کو دے دیا تھا. وہاں سے
دوسرے ایڈیشن کی فرمائشیں آرہی ہیں۔

میرے اس مجموعہ میں حُب اسلام حُب ملک حُب حریت
کی جھلک کے ساتھ یہ بھی پایا جاوے گا کہ شاعری کے اصناف
میں مجھے غزل بہت پسند ہے. میں نے اس کے میدان کو وسعت
دینے کی کوشش کی ہے پچاس پچاس بلکہ تین تین سو اشعار
غزل کے رنگ میں ہونے کے علاوہ مسلسل مضمون کی بھی غزلیں ہیں
کشمیر کا حال حریت۔ ہند۔ سچ حُسن۔ ہمت تلوار

قلم وغیرہ کے گیت غزل ہی کے رنگ میں گائے گئے

ہیں۔

غزل سے میں نے عاشقانہ رنگ بے شک خارج نہیں کیا

گل و بلبل کے لیے ہماری شاعری بدنام تھی مگر

"مانمی خواہیم ننگ و نام را"

میں نے التزاماً ہر ایک غزل میں حتیٰ کہ عرض حال بحضور

سرورِ کائنات تک میں گل کا لفظ استعمال کیا ہے۔

میں شاعری کے موضوع ہی کا لطیف و نازک ہونا پسند

کرتا ہوں اور غالب کے اس بیان کا قائل ہوں۔

مقصد ہے ناز و غمزہ۔ ولے گفتگو میں کام

چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

یہی راز ہے کہ آج دنیا میں کسی دوسرے شاعر کا کلام روح
انسان میں وہ کیفیت وجدانی نہیں پیدا کرتا جو حافظؒ
کا کلام پیدا کرتا ہے۔ باوجودیکہ "گل و بلبل"
"ساقی و شراب" سے وہ بھرا ہوا ہے۔
حافظؒ نے ہر مضمون کو نہایت لطیف اسلوب اور دلنشین
الفاظ میں ادا کیا ہے اور دوسرے کے دل کو اپنے جذبات سے
ہم آہنگ بنا دیا ہے۔ یہی کمال شاعری ہے اور یہی کمال مشرقی
شاعری کو مغربی شاعری پر فوقیت دیتا ہے ہماری شاعری
میں نہ صرف خیالات کی بہت بلند پروازی ہوتی ہے۔ بلکہ
کوشش اس بات کی کی جاتی ہے کہ اپنے قلب کے احساسات
تک دوسرے پر منتقل ہو جاویں۔ مثلاً کوئی شخص سیاہی میں بجلی
کی چمک دیکھتا ہے اور اس سے محظوظ ہوتا ہے اگر وہ مغربی شاعر
ہے تو وہ الفاظ میں اس سین (Scene) کا

من وعن نقشہ کھینچنے پر قناعت کرے گا کہ دوسرے کے سامنے
جس حد تک ممکن ہو وہ منظر پیش ہو جائے۔
لیکن اگر وہ ایک مشرقی شاعر ہو تو وہ صرف نقشہ کشی پر قناعت
نہ کرے گا بلکہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ دوسرے پر
بھی وہی کیفیت حظ و سرور کی طاری ہو جو خود شاعر پر ہوئی
اور کہے گا۔

ابر میں کوندتی تھی یوں بجلی   سی آلود لب پہ جیسے ہنسی

"سیر کشمیر" کی نثر میں بھی میں نے یہی کوشش کی ہے اور اس حد تک
کامیاب ہوا کہ مشہور نقاد سخن حامد علی خاں صاحب مرحوم
نے اسے پڑھ کر مجھے فوراً یہ تار کشمیر بھیجا تھا کہ مضمون خود
کشمیر کی طرح دلفریب ہے۔
جس کو اردو کی مسلسل نظم میں اس قسم کے کمال کو دیکھنا ہو وہ
شیخ احمد علی قدوائی صاحب شوق کے "عالم خیال" کو دیکھیے۔

میری کل کشمیر کی شاعری میں پارۂ دل شرافت سلمہ کو بہت
دلچسپی رہی جو مع عزیزہ بہ دل منجھلی بھاوج صاحبہ کے میرے ساتھ
ساتھ ہر جگہ کشمیر کی سیر میں رہیں اور مناظر سے لطف اندوز
ہوتی رہیں۔ اصل میں اپنے جان و دل کو محبوب اعزا کی ہم صحبتی
سے کشمیر کی سیر کا لطف دوبالا رہا۔ اپنی بچّی شرافت سلمہا کے
نام میں اس مجموعہ کو معنون کرتا ہوں۔

مشیر حسین قدوائی مشیر
(گدیہ۔ بارہ بنکی)

از ایچ ل۔ نینی تال

۹ ستمبر سنہ ۱۹۲۲ء

کشمیر

اڈیٹر صاحب الناظر آپ کی فرمائشات مضمون نویسی کو
ٹال کر میں اس باغ جنت نظیر یعنی خطۂ کشمیر پہنچا میں سال گزشتہ
ولایت جانے کے قبل بھی یہاں ہو گیا تھا۔ جب تک میں نے
اس حصہ ملک کو نہیں دیکھا تھا۔ میں اس قدر وطن پرست نہ
تھا۔ ہندوستان سے الفت مجھے اس کو دیکھ کر زیادہ ہوئی
اور مجھ سے زیادہ میرے بچوں کو جنھیں ولایت لے جانے سے
قبل میں یہاں لایا تھا۔ اب وہ انگلستان میں برابر کشمیر کی
مدح سرائی کیا کرتے ہیں اور ہندوستان کی بڑائی۔
کشمیر کی توصیف میں میرا قلم عاجز ہے۔ یہاں آکر بھی اگر کسی انسان
میں فطرت پرستی کا ذوق نہ پیدا ہو تو اُسے بے روح

سمجھنا چاہیے۔ فطرت کی ہر چیز یہاں دِل رُبا ہے۔ پہاڑ سی بھیانک
چیز یہاں پری نظر آتی ہے۔ اور پری بھی ایسی جو سبز پیشواز جس میں
چوڑا چکیلا پٹھا لگا ہوا پہنے فرطِ نشاط سے رقص کرنے کو موجود
ہو۔ دور سے دیودار اور چیڑ کے درخت اُس پیشواز کی ایک خاص
دلفریب انداز کی چھینٹ معلوم ہوتے ہیں۔ الغرض یہاں کے
پہاڑوں میں بھی جادو ہے،

دریا ہر جگہ دیکھیے اور تو اور خود جہلم ہی بہہ کر میدانوں میں
گیا ہے۔ مگر وہاں یہ بھی ایک میلا اور گدلا واک سا دریا ہے۔
برخلاف اس کے وہی جہلم کشمیر کے راستہ کی سبزی
کی نصف جان ہے۔ وہ اس کی اٹھکھیلیوں کے ساتھ روانی۔ وہ
اُس کا معشوق کی کمر کی طرح بل کھانا۔ وہ اس کی موجوں کا
پتھروں سے ٹکرا کر خوش گوار آواز یں پیدا کرتا
اور دل میں قریب ویسا ہی سرور لانا جیسا کہ پیالہ تو

(Piano) کے سفید پردوں پر کسی لعبت فرنگ کی اُنگلیوں
کے پڑنے سے اکثر پیدا ہوتا ہی۔ وہ اُس کا جگہ جگہ پر رنگ بدلنا
کبھی کف سے سفید کہیں سبزے کے عکس سے سبز۔ کہیں دور
کہیں نزدیک۔ کہیں پھسلتے ہوئے آہستہ ہونا کہیں زور
شور سے چلنا الغرض کشمیر کی سرحد شروع ہوتے ہی
اس دریا میں ایک کیفیت خاص پیدا ہوتی ہی۔ نشہ سا چڑھ جاتا
ہی۔ اور متوالا انداز جھلکنے لگتا ہی۔

سڑکیں ہمارے لکھنؤ میں بھی ہیں۔ بی گومتی کے پاس پاس
بھی بٹلر[1] صاحب کی خوش مذاقی سے سڑک بنائی
گئی ہی۔ بڑے بڑے پارکوں کے پاس سے سڑکیں

[1] آنریبل مسٹر ایس ایچ بٹلر جو آج کل گورنمنٹ آف انڈیا کے صیغہ تعلیمات کے ممبر ہیں لکھنؤ میں ڈپٹی کمشنر تھے اُن کو اس شہر سے خاص اُنس ہی اور اُنھوں نے اپنے زمانہ میں شہر کی آراستگی اور خوشنمائی کے لیے بڑی کوشش کی چنانچہ یہاں کی میونسپلٹی کو جو راہ اُنھوں نے دکھادی تھی اُس کو اُس نے ہنوز نہیں چھوڑا ہی۔ اور اگر ممبران میونسپل بورڈ کے تعصبات اور رجحانات سے قطع نظر کر لیا جائے تو بلا شبہ بہت کچھ شہر کی درستی ہو گئی ہی۔ اسی کی طرف لائق مضمون نگار نے اشارہ کیا ہی (اڈیٹر الناظر)

نکالی گئی ہیں۔ اور خدا بھلا کرے لکھنؤ کے ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈ کے بد دماغ ممبروں کا کہ اُن حضرات نے اپنی جدّت پسند مگر تکلیف رساں طبیعت سے پتھّر کی سڑکیں بھی شہر میں دوڑائی ہیں۔ مگر وہ اکیلی سڑک جو ہیں کے پتھروں کو پاش پاش کرکے بنائی گئی ہے۔ کوہالے سے سری نگر تک بے نظیر لطف دکھاتی ہے۔ دن کو دیکھو یا چاندنی رات میں اس سڑک کا منظر اور اس سڑک کا روپ ہی کچھ اور ہے۔ مجھے تو نہیں معلوم کہ دُنیا میں کہیں اور اس طرح انداز و ادا سے اونچی اور نیچی۔ ڈھلوان اور برابر۔ چوڑی اور پتلی ہوتی ہوئی کوئی دوسری سڑک ایک چنچل دریا کے ساتھ ساتھ سیکڑوں میل تک قریب قریب مسلسل دوڑی ہو۔

میں نے ایک اور دریا پر بھی اس سے پہلے دل دیا تھا یعنی ملک ہنگری (Hungary) کے

شہر بودھاپسٹ (Buda Pest) کے دریا ڈینوب
(Danube) پر مجھے وہاں اس دریا کی شاہانہ رفتار
شاہانہ انداز بہت بھلا معلوم ہوا تھا۔ مگر اس کا یہ انداز اور یہ رفتار
حسن جوانی سے بھی کم دیر پا تھا۔ برخلاف اس کے اِس
راہ کشمیر کے دریا کی خوبی و حسن کا لطف سیکڑوں میل تک
برابر اُٹھایا جا سکتا ہے۔ سڑک اور دریا پچاسوں کوس تک
ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ دریا دور ہو جاتا ہے مگر سڑک پر
چلنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل بہت کم ہوتا ہے۔ یہ
سڑک ملاے اعلیٰ تک پہنچنے کی کہکشاں اگر نہ بھی ہو
(میرے خیال میں تو ہے) تب بھی اس میں تو شک نہیں کہ
یہ باغ جنت کی راہ تو ضرور ہے۔

اس باغ جنت کی راہ کی سبزی کا حال قلم کیا لکھے
دل ہی کچھ اس کے مزے سے آشنا ہے۔ سبزی بھی

میں نے فرانس اور انگلستان قسطنطنیہ اور روسا
کی دیکھی اور اس مقام کے مناظر بھی دیکھے ہیں جس پر سارے
یورپ کو ناز ہے یعنی سوئیزرلینڈ Switzerland)
کے۔ مگر کجا ملک کشمیر اور کجا ذرا سا مقام سوئیزرلینڈ
کہاں یہ فطرتی منظر کے تمام و کمال حسن کا ایک نظر میں مشاہدہ
ہوجانا۔ اور کہاں اُن مناظر کا الگ الگ جادو کاوش
سے ڈھونڈھ نکالنا۔

میں نے کشمیر کے مقامات ابھی بہت کم دیکھے ہیں مگر
میں تو دنیا کے کسی خوش منظر سے خوش منظر مقام کے
مقابلہ میں صرف راہ سری نگر کے بے مثال منظر
کو پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میری آنکھوں میں تو اسی راہ
میں سب کچھ موجود ہے۔ اگر کسی کا دل حسن پرست اور چشم
خوش منظر ہو تو میرے ساتھ آئے میں اپنے دعویٰ کو

سچّا کر دکھاؤنگا۔

ینگ ہسبینڈ[1] نے جو یہاں کسی وقت رزیڈنٹ تھے ایک ضخیم کتاب کشمیر کے متعلق لکھی ہی ایک مقام پر اُنھوں نے ایک دلفریب صوفیانہ بات لکھدی ہی وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ بارہ سنگہ کے شکار کے لیئے وہ بہت سے شکاریوں کے ساتھ پہاڑوں پر گئے۔ باوجود پہاڑوں پر بہت اونچے چلے جانے کے بارہ سنگہ تو نہیں ملا مگر اُنھوں نے اوپر ایسا خوش آئند منظر دیکھا کہ روح پھڑک اُٹھی۔ لیکن اُنھوں نے اس منظر کا اثر نہ اپنے ساتھ کے شکاریوں میں پایا نہ گھوڑوں پر اور نہ اُڑتی چڑیوں پر۔ اس کا اُنھیں تعجب ہوا۔ اور اُسی حالت استعجاب میں

---

[1] سر فرانسس ینگ ہسبینڈ جنھوں نے لارڈ کرزن کے زمانہ میں مہم تبت میں خاص شہرت حاصل کی تھی وہ اب صوبہ سرحدی کے لفٹننٹ گورنر ہیں (اڈیٹر الناظر)

اُن پر یہ بات منکشف ہوئی کہ بینائی کے لیے صرف یہ آنکھیں کافی نہیں ہیں بلکہ روح کی مدد کی ضرورت رہتی ہو اسی وقت چیزوں کے اصلی اور صحیح حسن و قبح کا ادراک ہوتا ہے۔

ایک اور مقام پر سابق رزیڈنٹ نے لکھا ہے کہ ایک اُن کے انڈیا آفس[1] کے دوست دس روز کے لیے کشمیر کی سیر کو آئے اتفاق سے آٹھ روز تک برابر پانی برستا رہا۔ میزبان اور مہمان دونوں حالت افسوس میں تھے کہ نہ کچھ دکھایا جا سکا نہ کہیں آنا جانا ہوا آخر ایک دن خوش قسمتی سے پانی کھل گیا اُس روز شفق کا منظر ایسا بھلا تھا کہ مہمان نے کہا کہ وہ محض اسی ایک نظارہ کے دیکھنے کے لیے تمام مسافت اور تکلیف خوشی سے برداشت کر سکتے تھے۔

---

[1] وزیر ہند کا دفتر بمقام لندن۔

کشمیر میں گو چشم ظاہر بیں کے لیے بھی ایسا سامان ہے کہ دل پھڑک
اُٹھے مگر جس میں روح سے کام لینے کی بھی قوت ہو وہ
پہلے جوش میں "تو فطرت پرست بن جائے گا مگر پھر مضبوط
خدا پرست ہو جائے گا۔ یہاں بلا شبہ

ہر گیاہے کہ از زمیں روید
وحدہٗ لا شریک لہ گوید

یہاں کا سبزہ واقعی فرش مخمل سا ملایم ہے۔ جو چاہے ہمارے
کروکے[1] کے لان[2] پر آ کر اس کی تصدیق کر لے۔ فارگٹ می ناٹ
(forget-me-not) کے سے نازک پھول یہاں خود رو
جمتے ہیں اور یہاں کی زبان میں بیچارے جنگلی پھول کہلاتے
ہیں جنہیں کو فطرت کے بچھائے ہوئے رنگین قالین دیکھنا
ہوں وہ **گلمرگ جا کر آئل پتھری پہونچے**

1. کروکے (Croquet) ایک انگریزی کھیل کا نام ہے۔
2. ناہموار سبزہ جس مقام پر قینچی سے درست کیا جاتا ہو اس جگہ کو لان (Lawn) کہتے ہیں آج کل کے اکثر کھیل اسی قسم کے مقامات پر کھیلے جاتے ہیں۔ (اڈیٹر الناظر)

راستہ میں وہ فارس کے بہترین قالینوں کے نمونے دیکھ لے گا اور اپنے جسم میں بھی خون کا یہ زور پائے گا کہ خودبینی کا شوق آئنہ میں سرخ سرخ گال دیکھنے سے پیدا ہو جائے تو کچھ تعجب نہیں۔

اجی کیا کہیں اُس ظلم و بدعت کو جس کے ہم یہاں مرتکب ہوئے ہیں۔ نازک حسین۔ دلربا پھولوں کو اپنے بھدّے پانْوں سے روندا ہے۔ اور غضب پر غضب یہ کہ گھوڑوں کے سموں کے نیچے کچلا ہے۔ کبھی کسی خونی اور خودسر بادشاہ نے بھی اس قدر ظلم نہ کیا ہوگا۔ ایسی قیمتی جانیں اس سفّاکی و بے رحمی سے کسی نے نہ لی ہونگی۔ جس طرح ہم نے یہاں بے گناہ پھولوں اور نازک و نازنین گھاسوں کی جانیں لی ہیں۔ جن کو ہم اگر قدرشناس ہوتے تو اپنی آنکھوں میں جگہ دیتے۔ اپنے کوٹ کے کاجوں میں لگاتے یا کسی معشوق کو نذر کر کے اُس کے سینے سے لگے ہوئے دیکھتے۔ اگر خود ان پھولوں اور پتیوں کی خود فراموشی جس کو انگریزی قانون

کی اصلاح ہیں کانٹری بیوٹری نگلیجنس[1] Contributary negligence کہتے ہیں ہمارے بچاؤ کی پرزور دلیل نہ ہوتی تو بلاشبہ اپنی غارت گری کے باعث ہم قتل کے قابل ٹھہرتے۔ ہم مجبور تھے اس لیے معذور۔ یہ نازک پھول خود ہی ہماری راہ گھیر لیتے تھے جس طرف چلو وہ قدموں کے نیچے۔ یہ حسن اور اس پر یہ انکسار اے حسین انسانی معشوقو! سبق لو۔ وہ تمام پھولوں کا تاجدار گل گلاب بھی یہاں کثرت سے خودرو جمتا ہے۔ کوئی انسان اس کو قدموں کے نیچے لانے کی جرأت تو کر ہی نہیں سکتا اُس کا رعب حسن۔ اُس کے گرد کے کانٹوں کی سنگینیں اس میں مانع ہیں لیکن یہاں اُس کی جھاڑیاں کھیتوں کے گرد لگی میں نے خود دیکھی ہیں۔ افراط سے گلاب کے پھول ہوتے ہیں۔ کیسے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس قدر گلاب (Roses) رکھتے

[1] غفلت تائیدی

ہیں۔ اور کیسا بدقسمت ہو وہ جو ایک گلاب (Rose) کو بھی ترستا ہو
یہاں کے نمو اور جوش کی حالت کیا بیان ہو جب تک
ہم یہاں نہیں آے عرفی کے اس شعر کو مبالغہ سمجھتے تھے۔

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید   گر مرغ کباب ست بہ وبال پر آید

ہم نے دیکھا کہ خشک ٹہنیاں جو انگریزی پھلیوں سوئیٹ پیز
(Sweet Peas) کے چڑھانے کے لیے باغ میں لگائی گئی تھیں
درخت ہوگئیں سیب کے درخت کے ایک سال قلم لگائے
دوسری فصل میں اُنھوں نے پھل دیا۔ پانی کی سطح پر تھوڑی مٹی اور
گھاس پھوس ڈال کر دھان بو دیا کھیت تیار ہوگیا سُنتے ہیں کہ
وسیراے کے کیمپ کی بعض میخیں نمو کے جوش سے درخت
ہوگئیں۔ اور یہ تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حد بندی کے
جعفری کے ستون میں پتیاں نکل آئیں۔ اور تو اور ہم اپنے جوش
کی مثال پیش کرتے ہیں۔

چند روز کا عرصہ ہوا کہ ہم صرف دو روز گلمرگ اور آئل پتھری میں گذار کر رمضان کے باعث جلد سری نگر واپس آرہے تھے۔ گلمرگ سے اتر کر نیچے کی وادی کے منظر نے مست کر دیا۔ پہاڑ پر سے نیچے کا منظر آنکھوں میں کھپ گیا۔ ایک صاف صاف چشمہ سیاہی مائل گہرے سبز سبز پہاڑوں کے دامن میں پتلے پتلے نالے کھیتوں کے درمیان جگہ جگہ خوشنما درخت معلوم ہوتا تھا کہ کسی خوش مذاق انسان نے کروڑوں روپیہ صرف کر کے میلوں کی وسعت کا ایسا دل فریب باغ آراستہ کیا ہے۔ روشیں بنائی ہیں۔ نہریں نکالی ہیں۔ درخت نصب کیے ہیں سبزہ اُگایا ہے القصہ اس نظارہ سے طبیعت کو ایک خاص حرکت ہوئی۔ لینڈو پر بیٹھے یہ منظر دور تک دیکھتے چلے گئے۔ ہاتھ میں رضا علی صاحب وحشت کا دیوان[1] تھا جس سے غالب کی یاد آتی

[1] دیوان وحشت دفتر الناظر سے عہ میں مل سکتا ہے (اڈیٹر الناظر)

تھی ہم کو بچپنے سے حافظ اور غالب کا سودا ہے۔ حافظ کا تو اس قدر کہ اکثر یہ ہوس ہوئی ہے کہ اب رکن آباد ہو۔ گلگشت مصلےٰ ہو اور دیوان حافظ بس پھر ہم راحت قلب کے لیے کسی دوسری شے کے محتاج نہ رہیں وحشت کے دیوان کے اشعار۔ وادی تنگ مرگ کا نظارہ۔ دل میں امنگ نتیجہ یہ ہوا کہ گو ہم کو کبھی شاعر ہونے کا دعوے نہ تھا نہ اب ہے۔ مگر ہم نے اپنے ایک ساتھی[1] سے کہا کہ اس دیوان سے کوئی مصرع طرح دو تو غزل کہیں۔ انھوں نے کسی قدر تعجب سے اپنی پسند کا یہ مصرع دیا۔

یہ اقتضائے رسم مروّت ہے کیا کروں

ہم یہ قسم کہتے ہیں کہ ہم کو نہ تقطیع کرنا آتی ہے نہ بحروں پر عبور ہے پھر بھی کوئی آدھے ہی گھنٹہ میں ایک غزل[2] تیار ہو گئی جو بحر اور تقطیع میں

[1] عزیزی مشتاق احمد سلمہٗ

[2] بعد کو جو رد و بدل ہوا ہے اس کے ساتھ سب غزلیں اپنی اپنی ردیف میں ملیں گی۔

چاہے ناقص ہو۔ جوش قلب کو تو ضرور ظاہر کرتی ہے۔ اس پر بھی طبع
موزوں کا شوق پورا نہ ہوا دوسرے مصرع طرح کی فرمائش کی اور پھر
برجستہ دوسری غزل ہوئی۔ اب کیا تھا چسکا پڑ گیا۔ روز رے گذارنے
کا مشغلہ ہاتھ آیا۔ صبح اور کبھی سہ پہر کو دو تین روز یہی ہوتا رہا کہ ہم
مصرع طرح کی فرمایش کرتے اور اُسی پر غزل تیار کرتے

اِس خطۂ عالم کی مٹی تک فیاض ہے۔ پھلوں کی تو بہ کثرت کہ سیب
بکری۔ بھیڑے اور گھوڑوں کو خود ہمارے یہاں کھلائے جاتے
ہیں۔ دور اندیش فرماں روائے ملک نے یہاں کا غلہ باہر
جانے کی ممانعت کردی ہے۔ اس کی وجہ سے یہاں اناج خوب
سستا رہتا ہے۔ یہاں کی آرضی میں یہ قوت ہے کہ جو چاہو پیدا کرلو۔
جناب بھائی صاحب مشیر مال ریاست نے لکھنؤ کے
خربوزہ کا بھی تخم جمایا ہے۔ یورپ کے پھل یہاں آسانی سے
پیدا کیے گئے ہیں۔ ایک قسم کی امریکہ کی تمبا کو بھی بوئی گئی۔

جن لوگوں کو شکار کا شوق ہو ان کو بھی لطف رہتا ہے (trout)
ٹراوٹ مچھلی کے شکار میں بھی مزا ہے۔ حالانکہ میں نہیں جانتا کہ
جان لینے میں کیا لطف اور کیا مزہ خاص ہو سکتا ہے۔ مرغیاں
دو دو آنے ملتی ہیں جس قدر چاہو کھاؤ۔ الغرض پیٹ کی ماریاں
نہ حریص خوش خور انسان کو ہے نہ بیچارے بے زبان جانوروں کو
اوّل الذکر اگر چاہیں تو فرانس کی لطیف ناشپاتیوں اور مسقط
کے شیریں انگوروں ہی سے پیٹ بھر لیا کریں۔
آخر الذکر خودرو للی (lily) اور نازک فارگٹ می ناٹ
(forget-me-not) پر زندگی گذار سکتے ہیں۔
بیچارے غریب قانع لوگ چاول۔ جنگلی پھلوں اور دودھ
انڈوں پر بہ آسانی و بلا زحمت بسر اوقات کر سکتے ہیں۔
مجھے اکثر صرف ایک دو گھر فلک فرسا پہاڑ پر دیکھ کر تعجب ہوا
اور وہاں رات کو کیلی روشنی پر حیرت معلوم ہوئی لیکن اگر سچ کہہ دینا

ضروری ہے تو یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ مجھے اس مکان اور اس روشنی کو دیکھ کر رشک بھی ہوا کیسے مزے میں ہوں گے وہ لوگ جو دنیا کے آلام سے دامن بچا کر اپنے چوپاؤں کے ساتھ ایسے دور اور کور راہ مقام پر جا کر آباد ہو گئے ہیں اور فطرت کے مناظر سے ہم صحبت رہتے ہیں فطرتی چشموں کا پانی پیتے ہیں خودرو پھلوں پر یا بہ آسانی پیدا کی ہوئی ایک لمبی گھاس (شالی) کے تخم پر بے غل وغش زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور کچھ فوقیت ان کو ہم پر ہو یا نہ ہو مگر اس میں تو کسی طرح کو شک نہیں ہو سکتا کہ ان کی جگہ ہم سے ضرور بلند اور بہت بلند ہے۔ ہم زمین پر ہیں تو وہ آسمان پر۔ ہم یہاں فرضی و خیالی تہذیب کے کھڑاگ میں ضروریات زندگی کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ کوفت اور ہوس سے دل کو بے چین رکھتے ہیں۔ آنکھوں۔ ہاتھوں اور تمام اعضا کو کمزور اور راحت طلب بناتے ہیں۔ کشمیر میں رہ کر ہمیں یہ سودا ہے کہ برقی روشنی ہو۔ حالانکہ ہم معمولی ہی

روشنی کے عکس کو جھیلم میں دیکھ کر انوکھی آتش بازی کا لطف اُٹھاتے ہیں اور نئے چاند کے پرتو پر دل ہی نثار ہوتا ہے۔

جس طرح کھانے کا یہاں آرام ہے اوسی طرح رہنے کا بھی۔ چاہے پانی پر ہاوس بوٹ[1] (House boat) میں رہو۔ چاہے زمین پر پُرلطف مکانات میں۔ چاہے پہاڑ پر۔ آج کل گرمی پسند ہو سری نگر حاضر ہے۔ خوش گوار سردی کی خواہش ہو چند گھنٹوں کی راہ پر گلمرگ موجود ہے سب سے زیادہ لطف ہاوس بوٹ پر آتا ہے۔

ہاوس بوٹ میں مکانیت اچھی خاصی ہوتی ہے۔ اور ہر طرح کا آرام رہتا ہے۔ معلوم نہیں کسی منچلے نے بی گومتی کی سطح کو ہاوس بوٹ سے زینت دینے کا خیال کیوں نہ کیا۔ لکھنؤ کے لوگوں میں لاکھ نقایص ہوں مگر مذاق میں نفاست اور طبیعت میں رسائی تو وہ

[1] مکان نما کشتیاں اس طرح کی بنی ہوئی ہوتی ہیں کہ چھوٹے سے مکان کا کام دیتی ہیں۔

ضرور رکھتے ہیں۔

اکتوبر نومبر یا فروری مارچ میں ہاؤس بوٹ میں گومتی پر بھی کچھ نہ کچھ لطف آہی جاوے۔ طاعون سے شاید حفاظت الگ رہے گو کشمیر کا مقابلہ ہونا تو محال ہے۔ یہاں سماں ہی کچھ اور ہے۔ جس طرح زمین بدلی ہے۔ اس طرح آسمان بھی بدلا ہو تو کچھ تعجب نہیں۔

یہاں مصنوعات انسانی میں جو شخص شالامار اور نشاط باغ دیکھے وہ مغلیہ مذاق اور نفاست پسندی پر احسنت کہنے کے لیے مجبور ہوگا۔ ہزار صعوبت راہ برداشت کر کے دور دراز مقامات سے کشمیر سال بہ سال آنا ہی ان مرحومین کی تازگی روح کا پتہ دیتا ہے۔ پھر یہاں ایسے نفیس دل آویز باغات کا لگانا اُن کی خوش مذاقی کو اور چمکاتا ہے۔ قدرت کی کاریگری سے ایسی لطیف سازش پر دل عش عش کرتا ہے۔ پہاڑی صاف سفید چشموں سے اُنھوں نے

نازک اور لطیف کام لیے ہیں۔

افسوس کہ زمانہ کی گردش ان پیاری یادگاروں پر بھی دست درازیاں کر رہی ہے۔ کاش جہاں کروروں روپیہ بجلی کے بے مصرف کارخانہ میں لگا یا گیا ہے جہاں لاکھوں روپیہ جھیلم کو بعض جگہ گہرا کرنے میں سال بسال محض اتفاقی طغیانی کے خیال سے صرف ہوتا ہے وہاں دس پانچ ہزار ان لاجواب باغوں کی درستی میں صرف کیا جاتا جس سے روزانہ لوگوں کی روح کی پرورش ہو سکتی تھی۔ اور ایک ایسے زمانہ کی یاد بھی تازہ رہ سکتی تھی جس پر تاریخ عالم کو ناز ہونا چاہیے۔

شہر سری نگر کے ہر مقام سے دکھائی دیتی ہوئی ایک بلند پہاڑی ہے جس کو تخت سلیمان کہتے ہیں اس کی چوٹی پر سے جہاں ایک مندر بنا ہوا ہے جھیلم اور وادی سری نگر کا نظارہ دُنیا کے خوش آیند ترین نظاروں میں ہے۔ معلوم نہیں وہ مقام تخت سلیمان کیوں کہلاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہاں کا مندر

اہل ہنود کی فطرت پرستی کا پیارا نمونہ ہے۔

اُس زمانہ کے مصنوعات جس کو ہم اپنے زعم باطل سے نیم وحشت کا زمانہ کہتے ہیں شالا مار اور نشاط باغ ہیں۔ اس "مہذب" اور ترقی "یافتہ" زمانہ کے مصنوعات کا نمونہ شہر سری نگر ہے۔ اس سے زیادہ اس جنت نظیر ملک پر ظلم ہو نہیں سکتا تھا کہ یہ شہر اس طرح گندہ رکھا جاوے اور اس بے ڈھنگے طریقے سے آباد کیا جاوے۔

برقی روشنی یا طغیانی سے حفاظت کے سامان کوئی بھی اس بد مذاقی۔ اس بد انتظامی کی تلافی نہیں کر سکتے۔

ہیضہ سیکڑوں جانیں بیچارے غریبوں کی لے جائے بلا سے۔ مگر اہل دولت ٹھنڈی روشنی میں ضرور رہیں۔ اور ریاست پر کروڑوں کا بار بیکار ضرور پڑ جاوے۔ افسوس!!

میری سمجھ میں ایک بات اور نہیں آتی کہ دفتر دربار گرمیوں میں سری نگر آتے ہی کیوں ہیں گلمرگ کیوں نہیں جاتے گلمرگ کی

لطیف ہوا کام میں لانے کے قابل ہی۔ ہندوستانی اپنی شامت سے فائدہ نہیں اُٹھاتے دور دور کے یورپین آکر آباد ہوتے ہیں!!

عبرت۔ عبرت۔ عبرت!!!

موجودہ پرائیویٹ سکریٹری[1] کی خوش مذاقی سے دو ایک فن لطیف۔ موسیقی کے اُستاد بھی آج کل یہاں آ گئے ہیں۔ اصل تو یوں ہی کہ یہاں کے پہاڑوں کو جنبش دینے کے لیے وہ لکھنؤ کا اُستاد چاہیے تھا جس کو مُنّے خاں کہتے ہیں۔ مگر ایک جھالا ستار بجانے والے کے پرجوش راگ اور دوسرے نہایت سُریلی اور دل نشین ادا سے بینا بجانے والے کی موشگافیاں یہاں کے لطیف سماں سے ہمساز ہو جاتی ہیں۔

ریاست کشمیر کی آبادی کہتے ہیں پچانوے فی صدی مسلمانوں کی ہی۔ مگر افسوس اور صد ہزار افسوس کہ یہ مسلمان ایسے جاہل کثیف

[1] دیوان بدری ناتھ

قبر پرست۔ دروغ گو اور بزدل ہیں کہ اسلام کو ان سے عار ہوگا۔ ان کو مسلمان بنانا مسلمانوں کا فرض اولین ہونا چاہیے۔ مگر ان کو ہندوؤں اور آریہ سماجوں کے مقابلہ و مجادلہ سے کب فرصت۔

کشمیر کے مہاراج میں سرزمین کشمیر کی فیاضی کا اثر مکمل طور سے ہے اگر ان کے ہم صحبت اور مشیر اچھے ہوں تو وہ اس ملک کے بہترین بادشاہ ہوں۔

سری نگر — مشیر حسین قدوائی

یکم اکتوبر ۱۹۱۱ء — (بیرسٹر ایٹ لا)

سمن برتیں دلربا و جاں فزا ہو بوئے خوش در بوستاں یارب توش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کشمیر ٹنگمرگ — ۲۶ اگست ۱۹۱۱ء

ردیف الف

(۱)

ترا اپنا تو بھی تیرا سا خدایا ہو نہیں سکتا — یہ سر آگے بتوں کے خم ہو ایسا ہو نہیں سکتا

یہ دل اے مصطفیٰ غیروں پہ شیدا ہو نہیں سکتا — مقابل خُلق[۲] میں کوئی تمھارا ہو نہیں سکتا

نگہ سے قتل کر کے جان تازہ بخش کر لب سے — کہا ایسا کسی سے بھی تماشا ہو نہیں سکتا

[۱] چونکہ یہ مطلع حمدیہ مطلع دیوان ہونے کے لیے زیادہ موزوں تھا اور دوسرا مطلع نعتیہ مطلع ثانی ہونے کے مناسب اس لیے پہلے جو مطلع کہا گیا تھا وہ ۲۵ جون ۱۹۱۳ء کو جو غزل اسی طرح میں ہوئی اس کو دیدیا گیا۔

[۲] اشارہ ارشاد ربانی (انک لعلیٰ خلق عظیم)

ہزاروں پھول اس باغِ جہاں میں روز کھلتے ہیں — مگر اے گل مقابل کوئی تیرا ہو نہیں سکتا

تمہارا حسن میرا شوق دونوں پردہ در ٹھہرے — اُٹھا دو مہرباں وہ کہ پردہ ہو نہیں سکتا

نہ ہو جنبش لبوں کو جی اُٹھیں مُردے اشارے سے — یہ کام اس گل کا ہے تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا

وہ جھیلیں سختیاں میں نے کہ خود ہی کہہ اُٹھا ظالم — ہمارا سا کبھی پتھر دل کسی کا ہو نہیں سکتا

کنول پانی پہ ہو اور برف اونچے پہاڑوں پر — کوئی یورپ کا منظر اس سے اچھا ہو نہیں سکتا

مشیرِ بے نوا کا دل بھرا ہے نورِ ایماں سے
بتوں کے پیار کرنے سے وہ رُسوا ہو نہیں سکتا

---

۳۰ ستمبر ۱۹۱۱ء (۲) کشمیر سری نگر

لڑتے ہی آنکھوں سے آنکھیں ان کا میں دیوانہ تھا
اُن کی شوخی قہر تھی اُن کا چلن مستانہ تھا
پاس ساقی کے مرے پیرِ مغاں کیا کیا نہ تھا
نرگسی آنکھوں میں مے تھی۔ جام تھا پیمانہ تھا
حُسن کی ساری ادائیں ہوتی ہیں شہرت پذیر
گلُ کا ہنسنا تھا۔ کہ عالم میں یہی افسانہ تھا
سنگ اسود کو دیا بوسہ تو یہ آیا خیال
میں تو یوں بھی آستاں بوسِ درِ بت خانہ تھا
بن گئی یاں جان پر جس دم کہی اُس نے نہیں
واں ستم ایجاد کا یہ نازِ معشوقانہ تھا
میرے پہلو میں پری خانہ تھا۔ دل میرا حضور
آپ ایسے سیمبر کا جب وہ خلوت خانہ تھا

نالۂ لبیک سے دل مست ہوتا تھا مرا
زاہد و اللہ کا گھر بھی مجھے میخانہ تھا

ہائے وہ دل جو تھا سرمستِ غرورِ خودسری
پڑتے ہی افتادِ الفت بندۂ جانانہ تھا

میرے پہلو میں نظر آتی ہے جو خالی جگہ
اُس دلِ گم گشتہ کا ظالم یہیں کاشانہ تھا

ذکر تھا حور و قصور و باغ و مے کا وعظ میں
رنگ غالب حضرتِ زاہد پہ بھی رندانہ تھا

زندگانی کا مری باعث مری ہمت رہی
ورنہ دل ناکامیوں سے ایک حسرت خانہ تھا

لے گیا پھسلا کے اُن کو دشتِ تنہا میں شمیم
اے رقیبو۔ اب بھی کہتے ہو کہ وہ دیوانہ تھا

(۳۳)

سری نگر کشمیر — ۱۹ ستمبر ۱۱ ۱۹ء

چاند سے چہرے پہ زلفوں کا پریشاں ہونا
یہ ادا دیکھ کے آئینہ کا حیراں ہونا

مجھ پہ وہ غیر کے دھوکے میں تری لطف کی آنکھ
اور گھبرا کے وہ پھر تیرا پشیماں ہونا

حضرت عشق سے پروانۂ عمر جاوید
لوں۔ جو ہو اس پہ مبسر مجھے قرباں ہونا

یاد گل کی مرے گر لے کے نکلتا مجنوں
دیکھتا دشت جنوں کا بھی گلستاں ہونا

تن کی عریانی سے ہی اور ہی شان عاشق
ہی گریباں سے بجا دست و گریباں ہونا

شان عریانی تن کہتی ہی او دست جنوں
ہو میسر نہ گریباں کو گریباں ہونا

جوشِ پنہانِ محبت سے اُٹھانا آنکھیں
آنکھ سے آنکھ کے ملتے ہی پشیماں ہونا
جو ہوں کمزور انھیں لوٹ کے غارت کرنا
پھر بھی تہذیب پہ یورپ کا وہ نازاں ہونا
ہند میں تم کو غلامی نہیں منظور مشیر
چاہتے دل سے ہو پر بندۂ جاناں ہونا
یہ بھی جوہر ہی شرافت کا مشیر محزوں
اپنی تقصیر پہ خود آپ پشیماں ہونا



سری نگر کشمیر (۴) ۲۱ ستمبر ۱۹۱۱ء

مجھے دل پہ اپنے کچھ بھی اگر اختیار ہوتا
تو نہ یوں تڑپنے دیتا نہ یہ بے قرار ہوتا

جہاں دوسرا نہ ہوتا وہ بناتے ہم اک عالم
وہی ہم کلام ہوتا وہی ہم کنار ہوتا

وہ جفا سے اب ہیں تائب ہے قسم بھی عہد بھی ہے
یہ کروں میں کیا کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا

یہ پہاڑ اور سمندر یہ ہیں سدِ رہ تمھارے
انھیں میں ہوا بناتا اگر اختیار ہوتا

مجھے بادِ گل نے مارا مری خاک سے یقیناً
وہی گل نمو میں آتا جو کہیں مزار ہوتا

یہ وطن میں اپنی حالت ہے قیود کی بدولت
کہ قفس میں جیسے طائر کوئی بے قرار ہوتا

وہ مرے قریب ہوتے وہ نگاہیں کام کرتیں
کبھی تیر سے کلیجا کبھی دل فگار ہوتا

یہ ستم کا رحم دیکھو مجھے نیم جاں ہی چھوڑا
وہی تیر کاش ہوتا جو جگر کے پار ہوتا

مجھے دسترس جو ہوتا تو جدائی کیوں یہ ہوتی
تجھے آنکھوں میں بٹھا کر مرا دل نثار ہوتا

یہ نہیں کہ تیرے وعدے کا مجھے یقیں نہیں ہے
مگر اپنی زندگی کا نہیں اعتبار ہوتا

وہی تنگ مرگ[1] ہوتا وہی دل فریب وادی
جہاں شاعری کا سودا مجھے بار بار ہوتا

[1] کشمیر میں گلمرگ کے نیچے تنگ مرگ واقع ہے وہیں اول غزل مشتاق سلمہ کی فرمایش پر اس مصرع طرح پر جو انھوں نے دیوان وحشت سے دیا برجستہ ہوئی اور یہ سلسلہ چلا۔

وہی رنگ رنگ کے گل وہ حبیب گلبدن بھی
وہ نشاط[51] باغ ہوتا وہی شالامار[52] ہوتا
وہی زعفراں[53] کے تختے وہی یاسمن[54] کی خوشبو
وہی گل کنول[55] کا ڈل[56] پر وہی لالہ زار[57] ہوتا
وہ سفیدے[58] اینٹا وہ ادھر اور اُدھر سڑک کے
وہ نسیم[59] باغ ہوتا وہ حسین چنار[60] ہوتا

۵۱و۵۲ کشمیر کے بے نظیر و دلفریب باغ ہیں جن کا مثل دنیا کے پردہ پر نہیں اور جو مغلیہ مذاق کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہیں۔
۵۳ زعفران کشمیر کی خاص پیدائش کی چیز ہے تختے کے تختے بوئے جاتے ہیں اور بہار دیتے ہیں مگر کشمیر کی ہر زمین میں زعفران نہیں ہوتا۔
۵۴ نشاط باغ میں یاسمن کے پھول بہت لطف دیتے ہیں جب فصل آتی ہے تو سری نگر سے جوق کے جوق لوگ ان کی بہار دیکھنے جاتے ہیں۔
۵۵ کشمیر کی جھیلوں میں کنول کا پھول خوب بہار دکھاتا ہے۔
۵۶ ڈل جھیل کو کہتے ہیں۔
۵۷ کشمیر میں لالہ خودرو کا منظر عجیب دلفریب ہوتا ہے دیہات میں لوگوں کی مکانوں کی چھتوں پر اکثر کثرت سے لالہ دکھائی
دیتا ہے جو اک شعلہ جوالہ معلوم ہوتا ہے۔
۵۸ بارہ مولہ سے سری نگر تک قریب قریب مسلسل سڑک پر دو رویہ سفیدے لگے ہیں کہتے ہیں کہ دنیا کا یہ سب سے بڑا اونیو (avenue)
۵۹ نسیم باغ سری نگر میں چنار کا ایک باغ لب آب ہے خیمہ اکثر وہاں کھڑے کیے جاتے ہیں۔
۶۰ چنار کے درخت کشمیر کی جان ہیں عجیب شان رکھتے ہیں دکھیں ایسے چنار دیکھنے میں نہیں آئے یوں تو لندن میں
بھی ایک نسیم کا چنار ہے مگر وہ شان اور قد وقامت چنار کے ایک درخت پر ہم لوگوں نے نام کھود دیے تھے۔

وہی ہوتا بید مجنوں[1] جسے دیکھ کر تمھیں پھر
مجھے چھوڑنے کا سودا نہ مرے نگار ہوتا
وہی ہاروں[2] بھی ہوتا وہی صاف شاہی چشمہ[3]
جو ہوا تھا لطف حاصل[4] وہی بار بار ہوتا

[1] پانی کے کنارے بید مجنوں بہار دکھاتے ہیں۔

[2] ہاروں میں سری نگر کا واٹر ورکس ہے۔ (Water works)

[3] سری نگر کے پاس ایک چشمہ ہے جس کا پانی نہایت لطیف و ہاضم کہا جاتا ہے۔ ایک چھوٹا سا قدیم باغ موجود ہے باغ کی بغل میں خود رو گلاب حد نظر تک پہاڑ پہ لگے ہیں جب پھولتے ہیں عجب لطف دیتے ہیں۔

[4] جب شاعر اپنے شفیق بھائی شیخ مقبول حسین صاحب کے منسٹر مال ریاست کشمیر مقرر ہونے پر اول اول ۱۹۱۱ء میں کشمیر گیا تو بہت ہی لطف سے گذری خود بھائی صاحب موصوف کے جموں سے پہونچنے کے قبل شاعر اپنے عزیز بجان بچوں۔ زبیدہ بشرافت نشیر۔ احمد منسٹر سلمہم۔ اپنی حبیب دل منجھلی بھاوج اور اشتیاق حسن۔ مومن سلمہم اور ایک دو اور عزیزوں کے ساتھ پہونچ گیا۔ خوب سیر اور تفریح کے بعد پارۂ جگر شبیر و منسٹر سلمہم کو لیکر ولایت روانہ ہوگیا۔ مہاراجہ صاحب کشمیر نے خاص احکام سب کے آرام کے انتظام کے لیے اپنے اہلکاران کو روانہ فرمائے تھے۔ دریا کے سفر کے لیے اپنا موٹر لانچ بھی عنایت کیا تھا۔

وہی اچھے بل[1] کو چلتے وہی سیر باغ ہوتی
وہ پہاڑ[2] پر کا چڑھنا ترا یادگار ہوتا
وہ مزے کے انگور[3] اُنھیں کھیے مے کے شیشے
وہی سیب[4] جو کہ دل کو مرے خوش گوار ہوتا
وہی عکس[5] ماہ ہوتا وہی عکس ماہ رو بھی
جو وہ چار چاند ہوتے تو یہ دل نثار ہوتا

[1] اچھے بل کشمیر کی ایک بہت اچھی تفریح گاہ ہے ایک پرانا باغ بھی واقع ہے جو بہت اُجاڑ حالت میں ہے۔ بیچ میں ایک کوٹھی ہے جس میں ہم لوگوں کا قیام تھا۔

[2] بچوں کا ایک قطار میں شرافت سلمہا کی زیر کمان پہاڑ پر ذوق و شوق سے چڑھنا بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔

[3] کشمیر میں انگور کے کئی باغ ہیں جن میں سیکڑوں درخت ہیں۔ شاعر کو انگور سے خاص رغبت ہے

[4] اشتیاق سلمہ نے ایک چھوٹا سا سیب ہاتھ میں لیا اور فرمائش کی کہ اس کا ذکر بھی ضرور آجاوے۔

[5] جب ڈل کی سیر کو ہم سب چاندنی رات میں شکاروں پر جاتے تھے تو چاند کا عکس اور شکارے کے بیٹھنے والوں کا عکس پانی میں صاف نظر آتا تھا۔ اس شعر میں ایک نام کی رعایت رکھی گئی ہے اور اس طرح چار چاند بنے ہیں۔

وہی تخت مجکو ملتا جہاں بیٹھے تھے سلیماںؔ[۱]
کہ خیال سے پری کے مجھے شوق یار ہوتا

وہی آل پتھری[۲] بھی وہی برف کی پہاڑی[۳]
وہی لطف سیر حاصل سر آبشار[۴] ہوتا

وہی ہوتی سیر جہلم[۵] وہی ماہ رو بغل میں
وہی عکس ماہ ہوتا وہی حسن یار ہوتا

وہ بہار کوہ و صحرا وہی خوشنما مناظر
وہ چنری[۶] کے باغ ہوتے وہی سبزہ زار[۷] ہوتا

۱ تخت سلیمان سری نگر میں ایک پہاڑی ہے جس پر ایک مندر بنا ہوا ہے تخت سلیمان سے سری نگر اور خصوصاً جہلم کے پیچ و خم کا منظر نہایت ہی دلفریب ہے

۲،۳ گلمرگ کے آگے بلندی پر اور دشوار گذار راہ سے چل کر ایک چھوٹی سی جھیل ملتی ہے جو آل پتھری کہلاتی ہے جہاں اکثر لوگ تفریح کو جاتے ہیں جھیل پر برف جمی رہتی ہے سامنے بھی برف کی پہاڑیاں نظر آتی ہیں اکثر نیچے بہتے ہوئے نالے بھی برف سے جم جاتے ہیں

۴ اہربل کا مشہور آبشار ہے افسوس کہ بتہ جگہ پر واقع ہے ورنہ لطف دوبالا دیتا۔

۵ دریائے جہلم کشمیر کی روح رواں ہے شاعر نے شکاری و رہاؤس بوٹ اور موٹر لانچ سب پر جہلم کی سیر کی ہے

۶ سری نگر میں متعدد باغ چنری کے ہیں پھول اور پھل دونوں بہار دیتے ہیں۔

۷ کشمیر کا سا سبزہ کہیں کم ہوگا بھائی صاحب کے مکان کا لان (lawn) بالکل مخملی ہے۔

وہی سبز سبز بادل[1] وہی زرفشاں کنارہ
اُسی وضع پر کسی کا وہی پھر نکھار[2] رہوتا

وہ ثمر ہرے ہرے کے وہ طیور ہر شجر پر
کہیں نغمہ سنج طوطی تو کہیں ہزار[3] رہوتا

وہ بہار باغ بادام[4] اُدھر اُن سے لڑتی آنکھیں
جو اِدھر وہ پھیرتے رُخ تو گلِ انار[5] رہوتا

۱و۲ ایک بار ہری نگر کے ڈل سے ایک عجیب دلربا منظر دکھائی دیا۔ آسمان پر ایک جگہ سبز سبز بادل نظر آیا اور ڈوبتے آفتاب کی کرنیں پہاڑ سے نکلکر اس بادل کے کنارے اس طرح رنگین کرتی تھیں جیسے گوٹے چقمقین کی جھالر لگائی گئی ہو۔ خوش مذاق عورتوں نے سبز سے لوٹ کر اپنے دوپٹے اُسی طرح رنگ کر اور کنارے جھالر لگا کر اوڑھے۔

۳ کھتی رنگ کے پروں کا بلبل بھی کشمیر میں دکھائی دیتا ہے بھائی صاحب نے اس کے پالنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

۴ بادام کے بہت بڑے بڑے باغوں میں پھول اور پھل دونوں کی بہار رہتی ہے۔

۵ گل انار جنگلی بکثرت ہوتا ہے۔

وہی ہوتی سیر گلمرگ[۵۱] اسے پہلوؤں میں لیتے
وہی سبز سبز جنگل جہاں دیودار[۵۲] ہوتا
وہی صاف صاف[۵۳] پانی وہی چاندنی[۵۴] کی چادر
وہی مچھلیاں[۵۵] بھی ہوتیں کہ وہیں شکار ہوتا

۵۱ گلمرگ سری نگر سے قریب پہاڑی جگہ ہے اور جب سری نگر میں گرمی پڑتی ہے تو مہاراجہ صاحب اور زیادہ تر انگریز وہاں جا کر قیام کرتے ہیں کیونکہ وہ خوب سرد جگہ ہے گالف لنکس وہاں سے بہتر کہیں اور نہیں سمجھے جاتے کشمیر میں گل مرگ میں دیودار بھی بہت ہے۔

۵۳ صاف صاف پانی کے چشموں اور جھیلوں کی کشمیر میں کمی نہیں گاندربل میں صاف پانی کی خوب بہار ہے ویری ناگ وغیرہ کی طرف بھی بہت اچھے اچھے چشمے ہیں۔

۵۴ مغلیہ بادشاہوں نے کشمیر کے باغات میں جدت طرازی کی انتہا کر دی ایسے پاکیزہ نفیس باغات دنیا کے پردہ پر نہیں تختہ بند باغات ہیں۔ اوپر سے پانی کی چادریں نئے نئے اسلوب سے اس طرح گرائی ہیں کہ چاندنی رات میں بالکل کھلی ہوئی چاندنی معلوم ہوتی ہیں۔

۵۵ پہلگام کے رستہ میں اننت ناگ کے تالاب میں بے شمار مچھلیاں ہیں سری نگر میں ٹراوٹ مچھلی بھی پائی گئی ہے۔

وہ شفق[۱] کا منظر خوش کہ پہاڑ لعل اِس سے
اُنھیں ٹھنڈے ٹھنڈے شعلوں سے وہ شعلہ بار ہوتا

سرِ کوہ سے وہ اُٹھنا وہی جھومنا ہوا پر
وہی ابر کا تماشہ[۲] کہ جو پُر بہار ہوتا

وہی بین[۳] کار ہوتا تو وہی نثار[۴] ہوتے
وہی خوش گوار نغمہ جو جگر کے پار ہوتا

میں فقیر بن کے رہتا نہ ہیں نام عیش لیتا
مرے پاس کچھ نہ ہوتا وہ ستم شعار ہوتا

یہ تمام جشن ہوتا پہ وہ گُل اگر نہ ہوتا
تو مشیرؔ دل تمھارا وہاں سوگوار ہوتا

۱و۲ گلمرگ اور خود سری نگر میں اکثر غروب اور طلوع آفتاب کے منظر جو نظر آتے ہیں ان سے روح خوش ہو جاتی ہے جس وقت آفتاب پہاڑ کے نیچے ڈوبنے لگتا ہے اس کی کرنیں شعلہ کی طرح آسمان کو شل یاقوت لال کر دیتی ہیں ابر کا تماشہ بھی قابل دید ہوتا ہے۔

۳ مہاراجہ صاحب کے یہاں ایک بین کار نوکر تھا جو بہت ہی دل آویز طریقہ سے بین بجاتا تھا۔

۴ نثار علی نامی ایک بہت ہی اچھے ستار بجانے والے مہاراجہ کے یہاں ملازم تھے۔

سری نگر کشمیر — (۵) — ۲۷ ستمبر ۱۹۱۱ء

میں کبھی موردِ جفا نہ ہوا — یعنی وہ مجھ سے آشنا نہ ہوا

گُل بنا ڈوب کر لہو میں دل — پھر بھی گلچیں وہ باحیا نہ ہوا

کیوں نہ ہو شوق آئینہ بینی — جب مقابل میں دوسرا نہ ہوا

رازِ دل اپنا کھل گیا سب پر — گل و بلبل کا یہ فسانہ نہ ہوا

رحم اُن کو ذرا نہیں آتا — نالۂ دل بھی کام کا نہ ہوا

مال سمجھا وہ اپنا ہی ظالم — چھین کر دل مرا روانہ ہوا

آئے[۱] وہ گھر میں بیٹھے بھی کچھ دیر — نہ ہوا پر مرا کہا نہ ہوا

دل جو خونِ جگر کا پالا تھا — تیرے تیروں کا وہ نشانہ ہوا

مجھ کو ترچھی نظر سے کیا دیکھا — موت کا یہ بھی اک بہانہ ہوا

مجھ سے کہہ دیتا ہے رقیب کا راز — وہ کسی کا بھی آشنا نہ ہوا

اپنی ہمت کا آسرا ہی ہمیں — غیر کا ہم کو آسرا نہ ہوا

۱ے یہ لڑکپن کے زمانہ کا کہا شعر ہے۔

نہ ملا پر ہمیں وہ گل نہ ملا غنچۂ دل ہمارا وا نہ ہوا
مر کے چمکا وفا سے نام مشیر
دیکھو انجام بھی برا نہ ہوا

ایضاً

دل جو الفت سے آشنا نہ ہوا | کیوں وہ اک پارۂ سنگ کا نہ ہوا
پردۂ ساز الفت جاناں | ایک دم بھی تو بے صدا نہ ہوا
ہم نے دنیا میں یوں گزاری عمر | کوئی ہمدرد و ہم نوا نہ ہوا
جان فرقت میں یاس سے دیدی | کشمکش دل کا آسرا نہ ہوا
دل کے آتے ہی موت بھی آئی | عشق بازی کا کچھ مزا نہ ہوا
ہو گیا خار گلشن کشمیر | پاس میرے جو گل ہرا نہ ہوا
بال کھولے وہ بام تک آئے | نالہ اتنا بھی نارسا نہ ہوا
بحر عالم میں ہے خدا پہ گھمنڈ | مجکو کیا ڈر جو ناخدا نہ ہوا

افضل الناس ہو محمدؐ تم   تم سا دنیا میں دوسرا نہ ہوا
دیکھتے لوگ عیسیٔ ثانی   وارثؔ[1] باصفا مرا نہ ہوا
میری غفلت کا اقتضا ہو سزا   تیری رحمت کا اقتضا نہ ہوا
پا کے تم کو حبیب جانِ مشیر
دوسرے پر یہ دل فدا نہ ہوا



[1] پیر مرشد حضرت حاجی الحرمین حافظ قرآن سیدنا وارث علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سری نگر کشمیر (۷) ۱۲ اگست ۱۹ء

گر جلد جوش عشق دبایا نہ جائے گا — شعلہ اُٹھے گا وہ جو بجھایا نہ جائیگا

عالم ہے بیکسی کا یہی تو مزا رہے — بھولے سے بھی چراغ جلایا نہ جائیگا

اوراق روزگار پہ ہم نے لکھا ہے نام — اب آسمان سے بھی وہ مٹایا نہ جائیگا

غربت میں غرق بحر ہوئے ہم یہ جان کر — اہل وطن سے لاشہ اُٹھایا نہ جائیگا

اُلفت کے ترک کی ہے نصیحت بہت درست — ناصح مگر یہ زہر تو کھایا نہ جائیگا

مفلس سہی مگر ہے خدا پر ہمیں گھمنڈ — در پر کسی کے ہم سے تو جایا نہ جائیگا

کہتے ہیں ڈالکر مرے پہلو پہ اک نگاہ — شیشہ سا دل ہے ناز اُٹھایا نہ جائیگا

پکڑا ہے جس نے دامنِ محبوبِ کبریا — اُس قوم کا نشان مٹایا نہ جائیگا

حالِ دلِ مشیرؔ کو گل سے کہے گا کون — اُس سے تو اپنا حال سنایا نہ جائیگا

اُس گل سے جس پہ جان فدا کی مشیرؔ نے
مرقد پہ ایک پھول چڑھایا نہ جائیگا

(۸)

گدیہ

اپریل ۱۹۱۱ء

میں نہ کعبہ کا ہوا اور نہ کلیسا کا ہوا — ہاں یہ ستارہ دل اک گل رعنا کا ہوا

قرب حق سے مجھے پھر دارِ محن کو لایا — قہر میرے لیے اعجاز مسیحا کا ہوا

آ گئیں سر پہ بلائیں وہی کالی کالی — مجھ کو سودا وہی پھر زلفِ چلیپا کا ہوا

مر کے بھی چین کی اُمید کہاں اے ہمدم — دل مرا جب سے کہ بندہ بُتِ زیبا کا ہوا

کتنے توحید پرستوں کو مٹایا دم میں — معجزہ اب یہ نیا قوم نصاریٰ کا ہوا!!!

قوم مردہ میں محمدؐ نے نئی پھونکی روح — میں جو بندہ ہوا کس شرکِ مسیحا کا ہوا

حسن تھا ہوش رُبا حضرتِ یوسفؑ کا مشہور
نام کیوں عشق سے بار نام زلیخا کا ہوا

راہ وویل کشمیر

(۹)

۱۴ مئی ۱۹۱۱ء

ای مشیر اچھا ہوا تر تیرا داماں ہوگیا
خشک اوروں کے لیے تو بحر عصیاں ہوگیا

قیمت خونِ شہیدانِ وفا کو کچھ نہ پوچھ
قطرۂ خوں جو گرا لعلِ بدخشاں ہوگیا

نفس پر اپنے حکومت جب تجھے حاصل ہوئی
بس میں یہ سمجھا کہ اب میں شاہِ شاہاں ہوگیا

حُسن پر پڑتا نہیں گر عشق کا کچھ بھی اثر
پارہ پارہ کس لیے گُل کا گریباں ہوگیا

کافرو ہم پھیر اُلٹ دیں گے زمین و آسماں
یاد جیسے ہی ہمیں پھر درسِ قرآں ہوگیا

ای محمد کیا اثر تھا آپ کی تعلیم میں
اشرفِ مخلوقِ عالم میں سے انساں ہوگیا

جس گھڑی اس پر کھلا رازِ دلِ مضطر شبیر
قتل کا تیرے اسی ساعت سے ساماں ہو گیا

ایضاً

(۱۰)

ہائے جب سے میں اسیرِ کنجِ زنداں ہو گیا
دشت ویراں تشنہ لب خارِ مغیلاں ہو گیا

سینۂ صد چاک کا سینا عبث تھا چارہ گر
حاصل اس سے کیا ہوا گر زخم پنہاں ہو گیا

اک[1] حسین مہ لقا کا ہے وہ خلوت گاہِ ناز
آج کل گدیہ بھی برجِ ماہِ تاباں ہو گیا

محوِ زینت وہ ہوا تو میں ہوا محوِ خیال
آئینہ دیکھا کسی نے کون حیراں ہو گیا

[1] از نیاز مرحوم

داغ کھا کر مثلِ لالہ ہوگیا میرا جگر
اب وہ گلزار[1] حبیب دل کے شایاں ہوگیا

جاگزیں دل میں ہوا جب سے مرا وہ گلعذار
دل مرا میرے لیے خود ہی گلستاں ہوگیا

کیوں نہ پھر غول بیابانی کریں آتش زنی
درسِ قرآں سے جو غافل ہر مسلماں ہوگیا

رہ گیا ہی پاس تیرے کیا مشیرِ خستہ جاں
ایک دل تھا وہ نثارِ جانِ جاناں ہوگیا

[1] نام شاعر کے باغ کا جو گڈی پیٹ میں ہے۔

راہِ گُریز - باندی پورہ کشمیر (۱۱) ۳ جون سنہ ۱۹۳۰ء

غزل فارسی

می زنم من نعرۂ اسلام را | مست توحیدم نخواہم جام را

مُرغِ دانا را نہ یابی از فریب | برکش اے صیاد، ناداں دام را

منزلِ مقصود دور افتادہ است | تیز زن اے شہسوارم گام را

چوں شوم سرمستِ عشقِ نفس کُش | بر زنم بر سنگِ خارا جام را

یک نگہ از چشمِ مستانہ بس است | من نہ خواہم آبِ آتش فام را

ایمن از دورِ فلک ہر کس کہ ہست | او چہ داند رنگِ صبح و شام را

ساغرے پُر از مئے کُہنہ بدہ | تا نہ بینم فرقِ ننگ و نام را

تندی باشد مئے عرفانِ عشق | آں نہ شاید ہیچ طبعِ خام را

ای رفیقم چوں نشینی با حبیب | یاد کے آری منِ ناکام را

شافعی را کے بود الزامِ جور | سر بُرِد چوں مرغِ بے[لہ] ہنگام را

لہ منصور حلاج

اے محمدؐ خوابِ شیرینِ تو خوش　　می بَرد فریاد من آرام را

یا شوم[1] عزلت نشینِ کُنجِ کوہ　　یا بگیرم خدمتِ اسلام را

گوشۂ کشمیری باید مرا　　تا بسر آرم غمِ ایام را

مثلِ بُلبُل نالہ زن ہستم صبا　　ایں پیامم دِہ بہ گُل اندام را

اے مشیرِ کام جو بے جدّ و جہد

کَے بیابی تو بہ عالم کام را

لہ شاعر کے دل پر اُن حوادث کا از حد اثر ہے جو اسلام پر آ رہے ہیں۔ اس لیے یہ ارادہ قائم ہوا کہ بس اب تو یا دُنیا سے کنارہ کش اور یا ہر وقت خدمت اسلام میں انہماک و سرگرمی

سری نگر کشمیر (۱۲) ۲۵ جون ۱۳ ۱۹ء

مسیحا چھوڑ دو مجھ کو میں اچھا ہو نہیں ہو سکتا
ان آنکھوں کے مریضوں کا مداوا ہو نہیں سکتا

غنیمت وقت فرصت کا ہے جو کرنا ہے وہ کر لو
بہت دن عالم فانی میں رہنا ہو نہیں سکتا

نہیں ملتا وہ گل مجھ کو تو پھر آ موت ہی آئے
کہ اس حال زبوں سے میرا جینا ہو نہیں سکتا

خدا میرا معاون ہے مری ہمت مری ہمدم
کبھی میں دشت ویراں میں بھی تنہا ہو نہیں سکتا

ہوا کیا گر کسی کو بادشاہت مل گئی چندے
جھکوں ہم جنس کے آگے میں ایسا ہو نہیں سکتا

ہمیں کمزور پا کر اور چرکے دے دیئے تو نے
مگر اس ظلم کا انجام اچھا ہو نہیں سکتا

۵۷

نہیں جس قوم کو کچھ بھی بھروسہ اپنی قوت پر
یہ کہ دو اُس سے اس دُنیا میں رہنا ہو نہیں سکتا

اگر اے باغباں گُل سے محبت جرم ہے کوئی
مشیرؔ اس جرم کا مجرم اکیلا ہو نہیں سکتا



سری نگر کشمیر (۱۴۳) ۱۲ اگست ۱۹۱۳ء

لب پر گنہ کے بعد ادھر یا غفور تھا — اور پھر گناہِ تازہ پہ دل ناصبور تھا

آیا بہشت میں تو مرادِ دلی تھی اور — سمجھو نہ یہ کہ عاشقِ غلمان و حور تھا

دل پس رہا تھا غیر کی تکلیف دیکھ کر — ہمدردیِ بشر کا یہاں تک فتور تھا

جامِ شراب پھینک دیا لیکے جور سے — آنکھوں کی تیری یاد سے ایسا سرور تھا

ظالم نے اور تیر لگائے جگر خراش — جب سنگِ جورِ چرخ سے دل چور چور تھا

قطعہ

اک وقت تھا کہ ہم بھی تھے مسند نشینِ عیش — دل بادۂ شراب سے وقفِ سرور تھا

گل ایک ہاتھ میں تھا تو جام ایک ہاتھ میں — گویا بہارِ عیش کا ہر سو ظہور تھا

تھے مثلِ گبر دل سے پرستارِ مہروش — اس امتیاز پر ہمیں بیجا غرور تھا

آتش کدہ کو رکھتے تھے دن رات مشتعل — نظارۂ حبیب تجلیِ طور تھا

آتش کو ہم بھی جانتے تھے مایۂ حیات — اور سوزِ عشق سے دلِ مضطر تنور تھا

لیکن کچھ اس طرح ہوا زیر و زبر جہاں — ہم گل سے دور اور وہ گل ہم سے دور تھا

ظلمت حجابِ چہرۂ آتش کدہ ہوئی ۔۔۔ وہ گرمیاں نہیں کہیں اب یہ نور تھا

اے طلسمِ ہوش رُبا کے فریب میں ۔۔۔ ظاہر پرست عقل کا اپنی قصور تھا

تو بندۂ خدا سے پرستارِ بُت بنا ۔۔۔ ظاہر ہے اے مشیرؔ یہ تیرا قصور تھا

جنگِ جدالِ ہستیِ عالم میں اے مشیرؔ ۔۔۔ ہمت سے جس نے کام لیا باشعور تھا

سری نگر کشمیر (۱۴۳) ۱۹ اگست ۱۹۱۳ء

گو آبِ آتشیں سے مزہ کوئی دم ملا لیکن تھا بس سرور کے اتنا ہی سم ملا

باقی رہے گا اب نہ کسی اور کے لیے ہم اور خوش ہوئے جو ہمیں اور غم ملا

سوئے تھے ہم وہیں کہ بپا حشر ہو گیا آرام مر کے بھی نہ ہمیں ایک دم ملا

باعث ہوا نہ فرقتِ گل میں موت کا غم بھی اگر ملا تو نہایت ہی کم ملا

ہم جانتے نہیں کہ ہوا سر کا تاج کیا افتادہ خاک پر ہیں یہاں فرقِ جم ملا

ہم صوفیوں کی راہ سے منزل پہ آ گئے گو راستہ میں ہم کو بہت پیچ و خم ملا

اِک بحرِ بیکراں تھا معاصی کا اے مشیر

کر شکر تیرا گوشۂ دامن ہی نم ملا

گلمرگ

(۱۵)

۲۵ر اگست ۱۹۱۴ء

ایسی جھلک دکھائی کہ بسمل بنا گیا — یہ چاشنی چکھا کے وہ شیریں ادا گیا

اے بدگمان رقیب یہ ظلمت گواہ ہے — اس بدنصیب گھر سے مرا مہ لقا گیا

ظالم خراب ہوگا خود اپنے ستم سے تو — شعلے کو دیکھ شمع کو بھی وہ جلا گیا

فریاد لے چلے ہیں اسی کے حضور میں — دریائے خوں جو تیغ ادا سے بہا گیا

بلبل کو ہوش جب ہوا گل کی بہار کا — گلشن سے جب مرا گل رنگیں ادا گیا

یارب ہر اک گناہ میں قیامت کی تھی کشش — جنت وہ ہے میں کسی سے جو دامن بچا گیا

وہ رحمت دو عالم و فخر زمانہ تھا — جو طوق سے غلاموں کی گردن چھڑا گیا

گھیرا ہے سب طرف سے بلاؤں نے اے مشیر
ہمت سے کام لینے کا اب وقت آ گیا

"ہمت"

مرے قلب میں نور ہمت سے آیا ۔۔۔ ہلاکت سے مجھ کو اسی نے بچایا

مدد کو مری آئی ہمت اسی دم ۔۔۔ مصائب نے آکر مجھے جب ستایا

منور ہوئی بن کے وہ مہر انور ۔۔۔ مرے سر پہ جب ابر آلام چھایا

مجھے آگ حسرت کی جھلسا رہی تھی ۔۔۔ پہ ہمت نے اس کو بھی آکر بجھایا

ضلالت زمانہ میں چھائی ہوئی تھی ۔۔۔ مجھے رستہ حق کا اس نے دکھایا

اکیلا تھا میں اور دشمن ہزاروں ۔۔۔ پہ ہمت نے میری سبھوں کو بھگایا

مقدر ہوئی مجھ کو صحرا نوردی ۔۔۔ تو ہمت نے جنگل کو گلشن بنایا

کسی نے کیا وار کمزور پر جب ۔۔۔ بنی یہ سپر اور اس کو بچایا

مددگار جب بن گئی آ کے ہمت ۔۔۔ مرے جسم لاغر میں بھی زور آیا

نئی روح اس نے ہر انساں میں پھونکی ۔۔۔ غلاموں کو طوقِ گراں سے چھڑایا

جو ڈر ڈر کے چھپتے تھے جا کر گھروں میں — پکڑ کر انھیں مردِ میداں بنایا

لرزتے تھے جو موت کے نام تک سے — رہِ حق میں مرنا انھیں بھی سکھایا

کریں لوگ حاصل سب اپنے حقوں کو — اسی نے ہر اک کو سبق یہ پڑھایا

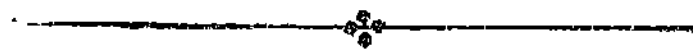
معاون ہوئی آ کے مظلوم کی بھی — کسی نے جو جور و ستم سے ڈرایا

مددگار وہ ہو گئی جس کسی کی — اسی نے کشادہ درِ فتح پایا

خدا نے بھی کی دستگیری اسی کی — قدم جس نے ہمت سے آگے بڑھایا

تمھیں گدگدایا مشیر آ کے اس نے

وہ گلدستۂ خار جب لیکے آیا



واپسی از سری نگر راہ اُڑی　　　16　　　۳۰ نومبر ۱۹۱۳ء

دورِ گردوں سے مشیر بے خبر روتا ہے کیا
حال دانہ کا درون آسیا ہوتا ہی کیا

آئے ہیں وہ میرے گھر میں آج خوشی سے بدحواس
المدد ای بخت تو اس وقت بھی سوتا ہی کیا

داغہائے حسرتِ دل لیکے یاں آئے ہیں ہم
ای مقیمانِ ارم دیکھیں یہاں ہوتا ہی کیا

یہ دلِ صادق ہے قیمت اس کی ہی ہر دو جہاں
اس متاعِ قیمتی کو ہاتھ سے کھوتا ہی کیا

داغ[1] میرے خونِ ناحق کا رہے گا حشر تک
وائے نادانی اُسے قاتل تو اب دھوتا ہی کیا

[1] اشارہ شہدائے کانپور کی طرف

نقد دل دیکر لیا ہے مول سودا درد کا
مثل بچوں کے پھر اب ای نوجواں روتا ہے کیا

ہے یہ اک دارالعمل - یاں لازمی ہے جدّوجہد
تو "اقوال وقال" ہی میں عمر کو کھوتا ہے کیا

میرے گل کو یاد آئے دل مرا اے باغباں
تخم لالہ باغ میں تو اس لیے بوتا ہے کیا

لگ رہی ہے آگ سب جا سوا نیزے پہ اب
اُٹھ مشیر بے خبر کمبخت تو سوتا ہے کیا

تم عدم سے آئے تھے بہر تماشا اے مشیر
کھول کر آنکھیں ذرا دیکھو بھی تو ہوتا ہے کیا

کشمیر سری نگر

۲۰ ستمبر ۱۹۱۱ء

ردیف (ب)

دے یا نہ دے وہ شوخ مرے نامے کا جواب
میں نے تو اپنی جان ہی کو دیدیا جواب

دیدہ دلیریاں ہیں ادھر ذوق و شوق کی
رُخ پر عرق حیا کا اُدھر با حیا جواب

ہم نے سوال دل کو نگہ سے ادا کیا
اُس نے بھی مسکرا کے دیا دلربا جواب

پُر درد آہ دل کو ہلا دیتی ہے مگر
دل دوز اُدھر سے ہو نگہ ناز کا جواب

یورپ سے جنگ ہو تو ہو تہذیب مادی
تلوار ہی سے ہوتا ہو تلوار کا جواب

نظمیر میں بہت سے حسیں پھول دیکھے ہیں
لیکن وہ گل ہے گلشنِ ہستی میں لاجواب
چوٹی پہاڑ کی کہیں لو جا کے اے مشیر
دید و تفکرات کو تم صاف سا جواب

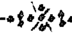


کشمیر سری نگر ۲۳ ستمبر ۱۹۱۱ء

ردیف (پ)

واقف ہیں اپنے حُسن اور اُس کے اثر سے آپ
پھر پوچھتے ہیں حال مرا نامہ بر سے آپ
کچھ میرے دل کی کہہ کے ہنسا دیجئے مجھے
گھبرائے واقعی ہیں اگر چشمِ تر سے آپ
کرتے ہیں مست بوئے گُلِ نو دمیدہ سے
یعنی صدائے خندۂ لبہائے تر سے آپ
ایڑی تک اور زلفِ معنبر بڑھائیے
بل کھا رہے ہیں چلنے میں نازک کمر سے آپ
چھپی ہوئی نظر بھی ہے آئے بھی دیر کو
کیونکر کہوں کہ آتے ہیں اپنے ہی گھر سے آپ

چھوٹی سی شب گلوں میں کٹی اور صبح کو
چلتے ہوئے ہیں پہلے نسیم سحر سے آپ
دھوکا ہوا ہے لالۂ کشمیر کا مگر
خوش خوش جو ہیں مشیر کے داغ جگر سے آپ



کشمیر سری نگر ۲۳ ستمبر ۱۱ ۱۹ء

ردیف (ت)

تیغ کو کھینچے ہوئے تیار ہیں ابروے دوست
تو چھپا لے گھونگروں میں دل کو ای گیسوے دوست

کیوں نہ شب ہائے جدائی میں گذاروں باغ میں
نکہتِ گل سے ذرا آئی تو ہے خوشبوے دوست

میں ہوا ہوں اس قدر محوِ خیالِ اتحاد
دشمنوں سے بھی مجھے آنے لگی ہو بوے دوست

جس طرح جاتا ہی برگِ کاہ سوے کہربا
دل مرا کھنچا ہوا جاتا ہی یونہیں سوے دوست

ہم کہاں اور اُن لبوں کی وہ حلاوت اب کہاں
جب مقدر نے کیا ہو ہم سے پنہاں روے دوست

۱۷

ڈگمگائے کیوں نہ میری کشتیِ عمرِ رواں
جنبشوں سے موج طوفاں خیز ہے ابروئے دوست
یاد ہیں کشمیر کی راتیں وہ تم کو اے مشیر
تکیہ[1] ہوتا تھا سرِ شوریدہ کا زانوئے دوست

[1] مصرعِ طرح۔

 ۲۳ ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء

ردیف (ث)

رخ ہے تہِ نقاب تو شوقِ لقا عبث — گل ہے نہاں نظر سے تو اس کی ہوا عبث

کانٹوں میں وہ گھرا ہے تو پھر دسترس محال — بلبل کے مثل نالۂ حسرت فزا عبث

تیغِ ادا کے سامنے ہے سر جھکا ہوا — پھر وہ پیراو نگاہ ستم آشنا عبث

تاروں کے مثل سارے حسیں ہیں جہان کے — تجھ سے مقابلہ انھیں ہے ادعا عبث

گلہائے گونہ گوں کے جو قائلیں چاہئیں — کشمیر کے سوا ہے کہیں ڈھونڈھنا عبث

انساں کی اصل ایک ہے انجام بھی ہے ایک — پھر ایک دوسرے کو برا جاننا عبث

وہ گل ہو گنج کو ہو حافظ کی ہو غزل — تسکین دل کی اور دوا چاہنا عبث

پتھر کے بت ہیں جانتے ہو تم انھیں مشیر
گر پگھلیں وہ اس کی فکر عبث التجا عبث

سری نگر کشمیر   ۲۴ ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء

ردیف (ج)

کچھ کچھ ضرور آہ میں رنگِ اثر ہے آج　　آمادہ لُطف پر اجابت و نظر ہے آج

دزدیدہ اِک نگاہ کرم پر حیا یہ ہے　　گویا کہ تازہ گُل پر اشبنم سے تر ہے آج

ہے چاندنی کا لطف شکارے[1] پہ سیر میں　　جہلم بھی اپنی رَو میں ذرا زور پہ ہے آج

ڈل پر ہی سیرِ صبح کنول کی بہار سے　　لپٹی ہوئی مہک سے نسیمِ سحر ہے آج

یہ کوہ یہ سماں یہ دُعا ذوق و شوق کی　　تاثیر ہم سے بھاگ کے جاتی کدھر ہے آج

ہاتھ آگیا تھا صبح مئے معرفت کا جام　　دُنیا مری نگاہ میں زیر و زبر ہے آج

وحدت کی مے سے بس کہ بہت مست ہے مشیر

دُنیا کے حال سے وہ بہت بے خبر ہے آج

[1] کشمیر میں ایک کشتی ہوتی ہے جس پر دریا کی سیر کی جاتی ہے اس کو شکارا کہتے ہیں جس طرح خوشنما (صفحہ ۷۰) کی کشتی گنڈولہ gandola کہلاتی ہے۔

کشمیر سری نگر ۱۴ ستمبر ۱۹۱۱ء

ردیف (د)

ہو رازداریِ الفت کا بھی مجھے ارشاد
جگر میں لیتے ہیں چٹکی بھی تا کروں فریاد

وہ بولے مردمِ دیدہ کو دیکے قوتِ برق
کہ دل کو تارِ نظر سے تو بھیج اپنی یاد

وہاں پہونچ کے نہ آئے نظر جو گلُ میرا
تو مجھ کو جنتِ رضواں ہو جنّتِ شدّاد

ثبوت اُن کے ستم کا نہ تا رہے باقی
فلک نے خاک بھی میری اُڑا کے کی برباد

خدا کرے تمھیں بھولے ہوئے کی یاد آئے
پھر آؤ دل میں کرو پھر یہ اپنا گھر آباد

۷۵

سمجھ کے آئی تھی بلبل کہ خلد ہے کشمیر
ہزار حیف یہاں بھی ہے تاک میں صیّاد

یہ عشق سرورِ عالم کا دل سے ہے اس کو
کہ ہے مشیرِ محمدؐ کے نام سے دلِ شاد



کشمیر سری نگر (۱) ۵ ستمبر ۱۹۱۱ء

ردیف (ر)

لہو دل کا کیا ہے اُس نے دل ہی میں نہاں ہو کر
خدا چاہے تو دل محشر میں خود بولے زباں ہو کر

سمایا میری آنکھوں میں تو کی جا کر جگہ دل میں
تمہارا حسن شوخی سے کہاں پہونچا کہاں ہو کر

تحمیں چین کیسا۔ گھر گیا دُہری بلاؤں میں
زمیں بھی میرے سر پر آ گئی ہے آسماں ہو کر

وہی گل جس کی خوشبو سے ہیں دیوانہ تھا دنیا میں
اُسی کی یاد میں ہوں بلبلِ باغِ جناں ہو کر

لگی ہے آگ ایسی شعلہ رو کے سوزِ اُلفت سے
کہ اُڑ جاتے ہیں میری آنکھ سے آنسو دھواں ہو کر

رقیبِ خود غرض نے دی صلاح کینہ جو اُن کو
کہ مجھ کو مار ڈالیں وہ ادا سے مہرباں ہو کر

کھلا اوجِ رسول اللہ معراجِ معلیٰ سے
بنے فخرِ زمیں کرسی نشین آسماں ہو کر

پہاڑوں میں گلوں میں برگ میں سب میں وہی جلوہ
نمایاں وحدتِ پنہاں ہے کثرت سے عیاں ہو کر

مری تصویر جب پہنچے تو یہ سمجھو کہ آیا ہے
مشیرِ کشتۂ غم شکلِ کاغذ ناتواں ہو کر[1]

مشیرِ خوشنوا اچھی غزل تم نے کہی لیکن
سخن وہ اور ہے جو دل میں بیٹھے نشترِ جاں ہو کر

[1] غزل وزیر۔

کشمیر۔ راہ پہلگام (۲) یکم جولائی ۱۹۱۳ء

یہاں نازش مرے دل کو محبت پر صداقت پر
وہاں وہ گُل بدن مغرور اپنی حسنِ صورت پر
نہ سمجھا میں کہا مجھ سے جب اُس نے "پھر ملیں گے کل"
کہ ظالم نے اُٹھا رکھا ہے ملنا اب قیامت پر
مریضِ عشق ہوتے ہیں مگر ایسے نہیں ہوتے
عدو بھی خون روتا ہے ہماری زار حالت پر
سرِ سلطانِ ہفت اقلیم بھی ملتا ہے مٹّی میں
گھمنڈ اچھا نہیں ہوتا کسی کا تاج و دولت پر
یہ حالت اشرف المخلوق کی بیداد کی دیکھو
کہ گلچیں رحم کھاتا ہی نہیں گُل کی نزاکت پر
اُصولِ دورِ عالم "ہر کمالے را زوالے" ہے
سُنا دو یہ انہیں غرّا ہے جن کو اپنی طاقت پر

ابھی ہم پھر ملا دیں گے کسی دن رُخ مسکوں کو
بھروسا اپنی طاقت پر ہے اور حق کی اعانت پر
اگر اے ایشیا والو حمیت کچھ بھی ہے تم میں
تو سب مل کر ہو اَب سینہ سپر اُس کی حفاظت پر
مسلمانو! امینِ وحدتِ حق ہو تو لازم ہے
تصدق اپنی ہستی کو کرو تم اُس امانت پر
نہیں میں بھول سکتا اپنے گدیہ[1] کی زمیں ہرگز
مرا دل لوٹ ہے کشمیر گو تیری لطافت پر
خطر کیا۔ ہو جو سر پر بارِ محشر میں گناہوں کا
اگر تم اے محمدؐ ہو کمر بستہ شفاعت پر
ملے گا اجر نیکی کا بلا شک اُس کی رحمت سے
مگر نازاں نہ ہو جانا ہمشیر اپنی عبا دت پر

[1] وطنِ شاعر۔

سری نگر (۳) ۱۳ ستمبر ۱۹ء

تلوار[1]

تلوار تو ہی جنگ میں کرتی ہے کام کا — تلوار تجھ سے امن بھی ہوتا ہے پائدار

تلوار جو اٹھاتی ہے عقل و شعور سے — ہوتی ہے بس جہان میں وہی قوم نامدار

تلوار تو وسیلۂ ظفر کا جہاں میں ہے — تو ہی غلام کو بھی بناتی ہے تاجدار

تلوار ہی کے ہاتھ میں اعزاز ہے مگر — کمزور پر لگانے سے کرتی ہے شرمسار

تلوار جس کے ہاتھ میں ہو ہے وہ سربلند — مفلس کو بھی بناتی ہے تلوار مالدار

سایہ میں سیف ہی کے بہشت بریں بھی ہے — گر راہِ حق میں ہو کوئی ہمت سے جاں نثار

تلوار یوں تو دہر میں چمکی ہیں اور بھی — پہونچی فلک پہ جا کے مگر تیغ ذوالفقار

تلوار تو ہی ہمت و قوت کی ہے نشاں — تلوار تو ہے ثروت و عزت کی یادگار

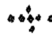
تلوار اپنا عیب کبھی رکھتی ہے ساتھ ہم — تلوار جس کے ہاتھ میں ہے وہ باوقار

مانا کہ ہے تمدن و تہذیب اور بھی — یورپ کی اوج کا ہے مگر تیغ پر مدار

[1] حسب فرمائش نورعین زین العباد سلمہ تحریر ... یہ نظم ہوئی۔

گر چاہتے ہو پھر کہ ہو حکمراں مشیر   تلوار اپنے ہاتھ میں لے لو پھر ایک بار
سکّہ اُسی کے نام کا چلتا ہے اے مشیر   جو تیغ آزمانے میں ہوتا ہے ہوشیار
خلدِ بریں ہے سایۂ شمشیر میں مشیر   گُل کی محافظت کے لیے سر بکف ہیں خار
شمشیر[۱] سے اُڑا کے سر پر غرور کو   دنیا میں کر دیا تجھے یوں اُس نے نامدار

[۱] شمشیر سے سر یعنی "ش" علحدہ کرنے سے "مشیر" کا نام نکلتا ہے۔



کشمیر سری نگر ۲۱ ستمبر ۱۹۱۱ء

ردیف (س)

مے بھی ہے اور گزک بھی ہے مرے یار کے پاس
مست آنکھیں نمکین خال بھی رخسار کے پاس

نالہ ہی شور ہے فریاد ہے الجھن ہے مگر
چین کمبخت نہیں مرغ گرفتار کے پاس

ستم دہر سے دل ہار نہ دینا ہرگز
دیکھ لو اس گل رعنا کی ہنسی خار کے پاس

دلربائی کا ہے وہ شوق کہ اللہ وغنی
سیکڑوں دل ہیں تڑپتے مرے دلدار کے پاس

نقد جاں کردے تصدق جو تو آجائے ذری
اور تو کچھ بھی نہیں ہے ترے بیمار کے پاس

بھیجدے اپنی مدد اے مرے رحمت والے
بوجھ بھاری ہے بہت تیرے گنہگار کے پاس

لوگ حیرت میں تجھے دیکھ کے رہتے ہیں مشیر
ہے گلے میں ترے تسبیح جو زنّار کے پاس

کشمیر سری نگر ۲۶ ستمبر ۱۹۱۱ء

ردیف (ش)

یہ اُڑا کے لائی ہے بوئے گُل میں ہوں اس نسیمِ سحر سے خوش
جو میں اک نظر اُسے دیکھ لوں تو ہو میری روح نظر سے خوش

یہ ورق یہ رنگ کہ دل کھنچے۔ یہ رگیں کہ جال بنا ہوا
یہ حسین خار، لطیف بو۔ میں ہوں گُل کے سارے شجر سے خوش

جو لڑی نگاہ نگاہ سے وہ چمک کے آنکھوں میں آ رہے
مری پتلیوں میں وہ رہ کے خوش ہیں میں اُن کی بانکی نظر سے خوش

شبِ ماہ گر نہیں تو نہ ہو مرا ماہ رو مرے پاس ہے
نہیں آسماں پہ نظر مری ہیں زمیں پہ اپنے قمر سے خوش

مجھے گل سے یادِ حبیب ہے وہی ناز کی وہی رنگ ہے
وہی بو ہے اور ہنسی وہی مرا دل ہے اس گلِ تر سے خوش

۸۵

اک ادا سے توڑ کے پھول کو اُسے رکھ کے پاس کمر کے وہ
مجھے چھیڑتے ہیں کہ تو ہے اب رگِ گُل سے خوش کمر سے خوش

مئے ارغواں بھی جو پی تو کیا گُلِ نو دمیدہ کی یاد میں
وہ غفور اپنے کرم سے خوش ہیں گناہِ تازہ و تر سے خوش

وہ نہ آئیں یاں تو نہیں سہی ملیں غیر سے وہ ہنسی خوشی
انھیں یاد آؤں کبھی کبھی ہیں دعا کے اتنے اثر سے خوش

وہ ہیں محو اپنے جمال میں نہیں ہٹتی آئینے سے نظر
انھیں کیا پڑی ہے کہ ہنس کے ہوں وہ شہیدِ خستہ جگر سے خوش

سری نگر کشمیر — ۱۴ ستمبر ۱۹۱۱ء

ردیف (ص)

وہ جو رکھتے ہیں دلربا اخلاص — میں بھی رکھتا ہوں باوفا اخلاص

سارے اوصاف کا خلاصہ ہے — غیر سے بھی نہ مل بلا اخلاص

عشقِ گل دے گا داغِ بدنامی — خار کے ڈر سے دب گیا اخلاص

ظاہری خلق غیر ہی سے رہے — چاہتا ہوں میں آپ کا اخلاص

بچ کے چلنا رہِ ریا سے مشیر
دشمنی بھی ہو تو ہو با اخلاص

کشمیر سری نگر — ۲۴ ستمبر ۱۹۱۱ء

ردیف (ض)

وہ ماہ رُو گر پاس ہو تو انجمن سے کیا غرض
آنکھوں میں جب پائے جگہ گل کو چمن سے کیا غرض

دل دل سے ملنے کو ملے آنکھیں اشارے کو ملیں
کیوں چاہئے شیریں زباں مجھ کو سخن سے کیا غرض

اُس گُل کا وہ نازک بدن کافی ہے بحرِ دلبری
سادہ ہو یا پُرکار حُسن پیرہن سے کیا غرض

آزاد جیتے جی رہا جب میں قیودِ وضع سے
پھر بعد مردن دوستو فکرِ کفن سے کیا غرض

یہ کیا لباسِ عاشقی پہنا ہے جو ہم نے یہاں
ملبوسِ نو سے کیا غرض دلقِ کہن سے کیا غرض

جب دل میں ہو ذوقِ فنا کس کام کا آبِ بقا
کیا ہو بہارِ جاں فزا سے اور چمن سے کیا غرض

دل لیکے میرا اب تمھیں سارا جہاں لینا ہے کیا
باندھے ہو کیوں تیر و کماں اس بانکپن سے کیا غرض

ہم چاہتے ہیں بیخودی ہم کو مزے سے کام کیا
کافی ہیں دو بوندیں ہمیں نو یا کہن سے کیا غرض

کشمیر میں رہ کر مشیر آئے تمھیں کیوں یادِ گھر
درویش ہو عاشق منش تم کو وطن سے کیا غرض

کشمیر سری نگر — ۸ر ستمبر ۱۹۱۱ء

ردیف (ط)

ہم سے ہے اُن کا دعویِ لطفِ نہاں غلط
ڈالیں رقیب پر نگہِ جانستاں غلط

گلچیں نہیں ہوں شوق مجھے دیدِ گُل کا ہے
مجھ سے ہے بدظنی تری اے باغباں غلط

ہے سیرِ گُل دو روزہ مگر خار دائمی
بلبل یہ شاخِ گُل پہ ترا آشیاں غلط

کھینچا ہے لعلِ لب کو مرے لب نے جذب سے
چوری کا اتہام غلط ہے گماں غلط

میں "آمرِ رب" ہوں اصل وطن میرا لامکاں
یہ ظاہری مکان یہ نام و نشاں غلط

خود اپنی غفلتوں سے یہ دیکھا ہے روزِ بد
پھر اب شکایتِ ستمِ آسماں غلط

رہ جاؤ یاں مشیر بُری یا بھلی طرح
کشمیر میں خیالِ چنیں و چناں غلط



کشمیر سری نگر — ۱۴ / ستمبر ۱۱ ۱۹ء

ردیف (ظ)

نہ غیروں کی مکر و دغا کا لحاظ — نہ اُن کو ہماری وفا کا لحاظ

توقع یہ دیوانہ پن سے ہمیں — کہ وہ بُت کرے گا خدا کا لحاظ

ملاتے نہیں آنکھ خلوت میں بھی — اِنھیں اس قدر ہے حیا کا لحاظ

بڑھے عشقِ گل بوئے گُل سے کچھ اور — مرض کیا کرے جو دوا کا لحاظ

نہ مایوس ملنے سے اُس گُل کے ہو — کہ مضطر کی ہوگا دعا کا لحاظ

مسلمان چاہیں اگر فتح و نصرت — ہمیشہ رکھیں مصطفےٰ کا لحاظ

مشیرِ الفتِ مصطفےٰ میں ہو محو
رکھو اُن کے نقشِ پا کا لحاظ

کشمیر سری نگر

۱۴ ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء

ردیف (غ)

نہ جاؤں گا میں سیرِ گلگشتِ باغ ۔۔۔ نہیں خندۂ بے محل کا دماغ

اُسی نے لگائی محبّت کی آگ ۔۔۔ وہی گُل ہے میرے قصرِ دل کا چراغ

اگر جان و دل ملک کے واسطے ۔۔۔ تو ہو روح کو قبر جائے فراغ

جو اہلِ نظر ہیں حضوری میں ہیں ۔۔۔ نہ پاؤ گے ظاہر پرستو سُراغ

کرے عشق روشن جو نامِ بشیر

بنے شمعِ مرقد بھی اُس گُل کا داغ

کشمیر سری نگر

۱۳ ستمبر ۱۹۱۱ء

ردیف (ف)

عشق جنوں نزا اک طرف دھڑکا خلش کا اک طرف
گل کی تمنا اک طرف کانٹوں کا کھٹکا اک طرف

پیکر ہے انگور کو مجھ سے بھی کہتے ہیں پیو
ہے پاس اُن کا اک طرف اور خوف عقبیٰ اک طرف

دل عشق میں جب گھر گیا کشمکش میں پڑ گیا
خوف خدا ہے اک طرف سودا بتوں کا اک طرف

عبرت ہے سیر باغ سے رنج و خوشی توام ہیں یاں
بلبل کا نالہ اک طرف گل کا تماشا اک طرف

کیونکر ملیں دونوں ہشیر اس خبط سے کیا فائدہ
کشمیر کا شوق اک طرف لندن کا سودا اک طرف

کشمیر سری نگر (۱) ۱۰ ستمبر ۱۹۱۱ء

ردیف (ق)

ہو گیا ہے دل اسیر دامِ عشق
دیکھیے ہوتا ہے کیا انجامِ عشق

عاشقی کی صبح تھی فرحت فزا
پر بلائے جاں ہوئی ہے شامِ عشق

دِل گیا عزّت گئی راحت گئی
لُٹ گیا آخر ہوا جو رامِ عشق

یادِ گُل ہے دِل میں لیکن چاہیے
شوقِ وصلت کی شراب و جامِ عشق

ایک کا دل دوسرے کو مل گیا
ہے یہی تو ابجدِ آلامِ عشق

دِل کو پتھر کر تو اُس بُت سے ملے
یہ غضب کا ہے مجھے پیغامِ عشق

دِل ہمارا فرد آزادی میں تھا
ہو گیا کمبخت وہ بھی رامِ عشق

مر گیا گر عاشقِ صادق بشیر
کون پھر روشن کرے گا نامِ عشق

کشمیر

(۲)

جون ۱۴ سنہ ۱۹ء

چاہیے پتھر کا دل ہنگام عشق — سخت ہوتے ہیں بہت احکام عشق

کہنے سننے کی ضرورت کچھ نہیں — دل کو دل سے جائے گا پیغام عشق

کافر و مومن فقیر و بادشاہ — جس کو دیکھو ہے اسیر دام عشق

مثل آہن کھنچ رہا ہے سب جہاں — سنگ مقناطیس رکھیے نام عشق

کیا تعجب ہے جو ہیں گر جن و ملک — اسکی حالت پر جو ہے ناکام عشق

دوست کو سمجھے ستمگر بے وفا — دل شکن ہوتے ہیں یہ اوہام عشق

جو ہیں تن پرور ہٹیں اس راہ سے — عاشقوں کو یہ ہے پیغام عشق

وہ تعلق جس سے دو دل ایک ہوں — دیدیا ہے سب نے اس کو نام عشق

مل گیا ہے دل کو گنج معرفت — کم نہیں ہے یہ تجھے انعام عشق

حسن سے غنچہ جیسے کلی کھل گیا — حسن تھا دانہ برائے دام عشق

کوئی پہونچا دے گا اک دن اے کشمیر — گل کے کانوں تک ترا پیغام عشق

اپنی حالت سے بہت خوش ہے کشمیر — چاہیے اک عالمے بدنام عشق

کشمیر سری نگر ۱۳ ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء

ردیف (ک)

وہاں زلفیں سنورتی ہیں نکھار ابتک سنگار ابتک
یہاں ہونٹوں پہ جاں آنکھوں کو اُن کا انتظار ابتک

ہمیں کیا باغ زینت پر ہے یا موسم مزے کا ہے
نہیں دیکھا جو گُل اپنا نہیں آئی بہار ابتک

نگہ کے اٹھتے ہی خنجر چلایا تھا ستمگر نے
یہ دل ہے خون فشاں ابتک یہ سینہ ہے فگار ابتک

اگر محراب ابرو میں نہ جھکتا ہیں تو چتون سے
کھچا کرتی علیؓ کا نام لیکر ذوالفقار ابتک

خدا کی ذات میں ہے حُسن یہ فتوٰی بلاجب سے
دمِ آخر ہے مگر پوجا تجھے ہے گلعذار ابتک

خدا جانے لگا دی آگ کس کے حسن نے دل میں
نکلتا ہے دھواں میرے دہن سے بار بار ابتک

مشیرِ خستہ جاں پر ہی پری کا سایہ برسوں سے
مجھے اس کا تعجب ہے کہ ہے وہ ہوشیار ابتک

کشمیر سری نگر

۱۶ ستمبر ۱۹۱۱ء

ردیف (ل)

دو دن کے واسطے ہیں فقط خندہ ہائے گُل
آنسو لہو کے روئے گا اے مبتلائے گُل

کیوں ڈھونڈھتی ہے بلبلِ ناداں اِدھر اُدھر
دِل میں مرے چھپا ہے لہو کی بجائے گُل

نادار ہوں پہ عشق نے ہمت بلند کی
حاضر یہ نقد جاں ہے برائے بہائے گُل

نازک ورق لطیف ہو بو، رنگ خوشنما
اور دل کو چھید لیتے ہیں یہ خارہائے گُل

گُل ہو چراغِ عمر پہ گُل کی ہوا نہ جائے
آئے مزار سے بھی صدا ہائے ہائے گُل

بُلبل تجھی کو تاجِ محبت مِلا مگر
وہ کون دل ہے جو نہ ہوا مبتلائے گُل

قسمت ہے اپنی اپنی گلہ کس کا ہم کریں
غیروں کو بوئے گُل ہے ہمیں خارہائے گُل

بُلبل سکھائے گی اُسے کیا عاشقی کے طرز
یومِ الست سے ہے یہ دل مبتلائے گُل

ہم اور وہ ہیں باغ کا ساماں کیے ہوئے
یاں دل ہو لالہ زار وہاں خندہائے گُل

اے عندلیب آ ترا ہمدرد ہے مشیر
اس پر جفائے یار ہے تجھ پر جفائے گُل

کشمیر سری نگر ۱۴ ستمبر ۱۹۱۱ء

ردیف (م)

ہوتے ہیں مست اس نگہِ تند خو سے ہم
پیتے نہیں شراب قدح یا سبو سے ہم

وہ دن گئے کہ باغ کی سیریں تھیں روز و شب
زندہ ہیں اب تو بس گلِ نازک کی بو سے ہم

پابندیِ حنا کی شکایت پہ یہ کہا
تلووں کو اب رنگیں گے تمھارے لہو سے ہم

چھپ کر وہ ہم سے آئنہ بینی میں محو ہیں
کیا جانیں دیکھتے انھیں کس آرزو سے ہم

ہے گو شعار آشتی و حلم و انکسار
دبتے مگر نہیں ہیں کسی جنگجو سے ہم

برچھی لگا کے وہ نہ پشیماں ہو کہیں
پنہاں کریں گے زخم کو اُس ماہرو سے ہم

کچھ کہتی ہے صدا تری او قمریِ چمن
حق سرّہٗ کو سُنتے ہیں تیرے گلو سے ہم

شہ رگ[1] کے پاس ہادیِ برحق بتا گئے
بیٹھے تھے تھک کے جبکہ تری جستجو سے ہم

کہتے ہیں وہ مشیرؔ نہ ہم سے ملا کرو
گھبرا گئے ہیں اب جگرِ صد رفو سے ہم

[1] قرآن میں ہے کہ خدا شہ رگ سے بھی قریب تر ہے۔

کشمیر سری نگر　　　　(۱)　　　　۲۶ اگست ۱۹۱۱ء

ردیف (ن)

دل آگیا جو اُن پہ طبیعت ہے کیا کروں
قد کھپ گیا نظر میں قیامت ہے کیا کروں

داغِ جگر کبھی ہے تو دردِ جگر کبھی
میرے جگر پہ اُن کی عنایت ہے کیا کروں

بیٹھے ہیں پتلیوں میں مرے دل سے روٹھ کر
خوں گشتہ دل سے اُنھیں نفرت ہے کیا کروں

زر کیا ہے نقدِ جاں کو بھی کر دوں نثار میں
اُس گل سے میرے دل کو محبت ہے کیا کروں

حاضر جو اک نگاہِ کرم کے لیے ہے جاں
مقتضائے جوشِ الفت ہے کیا کروں

وارفتہ دل کے ساتھ ہے روحِ لطیف بھی
کشمیر جائے حسن و لطافت ہے کیا کروں

کھنچتا ہے سینری[1] کی طرف دل نظر کے ساتھ
مائل کشش پہ اس کی نفاست ہے کیا کروں

کیوں مر گیا نہ اک نگہِ ناز سے مشیر
اس زود رنج کو یہ شکایت ہے کیا کروں

[1] انگریزی کا لفظ ہے معنی منظر کے ہیں۔ مگر زیادہ تر قدرتی منظر سبزہ آب کوہ و صحرا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے اس موقع پہ انگریزی ہی کا لفظ رکھا گیا کہ وہ کشمیر کے دلربا منظر کے لیے بہت مناسب لفظ ہے۔

کشمیر سری نگر (۳) ۲۸ اگست ۱۹۱۱ء

ہم محو اس قدر ہیں تمنائے یار میں — کھوئے ہوئے سے رہتے ہیں اپنے دیار میں

آنکھوں میں آگیا مرا دم انتظار میں — ہیں محو آئینے کو لیئے وہ سنگار میں

رحمت طلب ہیں کہتے ہیں جنت وہاں نہیں — کیوں بیٹھیں ہم تمھارے دلِ بے قرار میں

بیداریٔ حیات میں جھگڑے تھے رات دن — سوئینگے نیند بھر کے اب اپنے مزار میں

بلبل کی شکل دل کے نوا سنجیاں کروں — وہ گل اگر ملے مجھے فصلِ بہار میں

دل سے خفا ہیں شوق ہی ہے سیرِ باغ کا — چھوڑ آئیں ہم بھی دل کو کسی لالہ زار میں

چوری کے اتہام کو دشمن نہ اب اٹھائیں — دل پاس ہی تمھارے ہے تم آؤ کنار میں

کشمیر جانے والوں کے دل سے یہ پوچھیئے — کیا خوشنمائیاں ہیں درختِ چنار میں

ہر شخص ہے اسیرِ غلامی یہاں ہشیم

کب تک رہو گے تم کہو ایسے دیار میں

کشمیر سری نگر (۴۳) ۲۷ ستمبر ۱۹۱۱ء

بلبلِ زار سے بھی زار فزوں تر میں ہوں
کس قدر والۂ شیدائے گُل تر میں ہوں

اُس کے قامت کو یہ دعویٰ کہ قیامت ہے یہیں
اُس کی چتون کا اشارہ ہے کہ خنجر میں ہوں

کشمکشِ دیر و حرم کے لیے دل میں تھی کبھی
اب تو اُفتادہ ستمگر ترے در پر میں ہوں

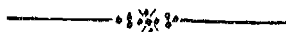
بلبلیں گل سے ملیں۔ شمع سے پروانے ملے
دور محبوب سے پر ہائے مقدر میں ہوں

مائل صلح میں سمجھا کہ وہ تھا خالی ہاتھ
کھینچ کے ابرو نے کہا اُس کی کہ خنجر میں ہوں

جرم ٹھہری یہ دلیری کہ ہوں عاشق تیرا
سب جفاؤں کا سزاوار ستمگر میں ہوں

۱۰۶

کتنا دشوار رگِ جاں کا بچانا ہے مشیر
ہر نظر اُن کی یہ کہتی ہے کہ نشتر میں ہوں



سری نگر کشمیر (۸۴) ۲۲ جولائی ۱۹۳۱ء

گنہگار پیری میں جو رو رہے ہیں — وہ اب داغ ہائے گنہ دھو رہے ہیں

پہونچنے پہ ہیں ہمسفر منزلوں پر — مگر نیند غفلت کی ہم سو رہے ہیں

زمانہ میں بچوں کا دل کیوں نہ بہلے — کہ کیا کیا تماشے یہاں ہو رہے ہیں

ریاضت کا پھل دیکھیے کیا ملے گا — ابھی تو یہاں تخم ہم بو رہے ہیں

بڑا دور دورہ ہے اپنی خودسری کا — غریبوں پہ کیا کیا ستم ہو رہے ہیں

تگ و دو سے ہنگامہ آرا ہے خلقت — یہاں چادریں تان کر سو رہے ہیں

گئے نل دمن قیس و لیلیٰ جہاں سے
مشیر اور وہ گل بس یہی دو رہے ہیں

گلمرگ (۵) ۲۱ر اگست ۱۹۱۳ء

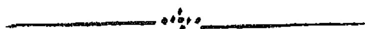
مُشیر تیرے دلِ حزیں کو حسیں نشانہ بنا رہے ہیں
وہ زعم میں اپنے گُل کی اُلفت کو تیرے دل سے بُھلا رہے ہیں
کھلے گا دنیا پہ ظلم اُن کا مجھے لگا ہے اسی کا کھٹکا
وہ میرے داغِ دل و جگر کو عبث تماشا بنا رہے ہیں
ستم یہ اُن کے ستم اُٹھائے۔ ہزار تیر قضا بچائے
وہ تھک کے میرے مقابلہ سے اب ایک عالم کو لا رہے ہیں
چھپائے ہیں آستیں میں خنجر۔ ہوا اصل میں دل بھی کینہ پرور[1]
میٹھی میٹھی وہ گفتگو سے سبھوں کے دل کو لبھا رہے ہیں
وہ ناسمجھ ہیں نہیں ہے اُن کو تمیز اچھے بُرے کی مطلق
فریب میں دشمنوں کے آکر وہ دوستوں کو جلا رہے ہیں

[1] لفٹنٹ گورنر صوبہ کے مزاج پر نگاہ رکھ کر یہ شعر پڑھا جائے۔

کبھی ہے عارض پہ آتی بلبل کبھی اُدھر پھول پر ہے جاتی
وہ ہاتھ میں اپنے گل کو لیکر نیا تماشا دکھا رہے ہیں

نہیں ہے کوئی جہاں میں جس کا ہو اس کا حامی جہاں ہو جس کا
عتاب ہوگا خدا کا اُن پہ جو بیکسوں کو ستا رہے ہیں

بُرے ہیں جو خود وہ دوسروں کو بھی لامحالہ بُرا کہینگے
مشیر بکنے دو اُن سبھوں کو جو تم کو تہمت لگا رہے ہیں



گلمرگ

(۶)

۱۴؍اگست ۱۹۱۳ء

جو اس نگاہِ ناز کی مستی کو دیکھ لیں — وہ دخترِ رز کے نشہ کی پستی کو دیکھ لیں

ہے ادعائے نفرتِ بُت جن کو وہ ذرا — کعبہ کو جا کے سنگ پرستی کو دیکھ لیں

کھینچا جو میرے عشق نے اُٹھ کر کہا چلیں — اُس خانماں خراب کی بستی کو دیکھ لیں

گُل ہاتھ میں لیے ہوئے پھرتا ہوں کو بہ کو — کیا ڈر جو لوگ حُسن پرستی کو دیکھ لیں

دل چپ ہوں لاکھ ظلم نہ جاؤں نگاہیاں سے میں — تا لوگ میری ملک پرستی کو دیکھ لیں

جو چاہتے ہیں عشق کا کاشانہ دیکھنا — گلمرگ[1] کو آ کے وہ میری بستی کو دیکھ لیں

اب آ گئے ہیں یاں تو یہ لازم ہے اے ہشیم
ہم اس نگارخانۂ ہستی کو دیکھ لیں

[1] وطنِ شاعر

مہری نگر۔ درمیان ۸ و ۹ بجے شام (۸) ۲۹ اگست ۱۹۱۳ء

قانون[1]

مصحفِ پاک بلا شک ہے خدا کا قانون — اس سے کوئی نہیں ہو سکتا ہے اچھا قانون
کام قانون کا ہے حفظ حقوقِ غُربا — رُعبِ دولت سے جو جھک آئے وہ ہے بودا قانون
یار سے عشق عدو سے بھی مروت رکھنا — میں نے اپنے لیے دیکھو یہ بنایا قانون
جان لیتا ہے مگر تیغِ ادا سے ظالم — اُس کو چھو تک نہیں سکتا ہے کسی کا قانون
لاکھ وہ ظلم کریں پر نہ کوئی دم مارے — پھر یہ دعویٰ کہ ہے میرا بہت اچھا قانون
زندگی تک ہے فقط جور و جفا کی ہستی — کیا بگاڑے گا شہیدانِ وفا کا قانون
کھل گیا زعمِ عدالت کا لفافہ آخر — ہاتھ میں اپنے ذہیوں کے جو رکھا قانون
جُرم کوئی نہیں بڑھ کر ہے دل آزاری سے — ہیں وہ نادان فقرا اُن کو بتانا قانون
خونِ انساں کا بہانا بھی جو جائز کر دے — کوئی بتلا دو کہ وہ کیسی ہے بھلا کیا قانون

[1] یہ نظم کانپور کی مسجد کے واقعۂ حائلہ کے بعد اور حکومت کی طرف سے قانونی کارروائی کرنے پر لکھی گئی۔

نوک تلوار کی ہے نوک قلم کی گویا — خون سے خاک کے صفحے پہ جو لکھا قانون

اپنے حق کی نہ کرے کوئی حفاظت تنہا — تم نے کس کنج سے آخر یہ نکالا قانون

ہے جو کاغذ کی قلمرو پہ عدو کا قبضہ — یہ غضب کی ہے عدالت یہ بلا کا قانون

ماہ وش جو ہیں انھیں قتل عمد بھی ہے معاف — اے ستمگر یہ کہاں کا ہے نرالا قانون

فرض ملت کے ادا کرنے پہ مجرم ہونا — کوئی للہ بتا دے یہ ہے کیسا قانون

اُس کو معلوم ہے ہوتی ہے جو قاتل کی سزا — عارفانہ یہ تجاہل ہے کہ ہے کیا قانون

ظلم مظلوم پہ ہو پھر وہ سزا بھی پائے — ہوشیاری سے یہ کیا خوب بنایا قانون

راہ حق کونسی ہے اُس پہ چلیں سب کیونکر — حیف تجھ پر جو نہ تو نے یہ بتایا قانون

عشق گل کی خلش خار سزا رکھی ہے — باغباں نے یہ بنایا ہے پھڑکتا قانون

دل میں آتا ہے جو اُن کے وہی وہ کرتے ہیں — اُن کو معلوم نہیں ہوتا ہے کیسا قانون

ہو حسینوں کی شریعت میں مظالم جائز — پر نہ بھولیں کہ ہے اک سب سے اعلیٰ قانون

اپنے قانون پہ ہے فخر تمھیں اہل وطن — جان لو پر ہے بہت بڑھ کے خدا کا قانون

قتل کا فیصلہ جو کرتا ہے قاتل کے سپرد — اس میں کیا شک ہے وہ ایک نرالا قانون

جان سے بھی ہے زیادہ جنھیں ایمان عزیز
اُن کا کچھ کر نہیں سکتا ہے تمھارا قانون

کیسے نادان ہیں وہ کہتے ہیں قاضی سے
ہم نے پہلے بھی کئی بار تھا توڑا قانون

قتل کر کے تجھے کیوں لاش چھپائے وہ مشیر
جانتا ہے کہ ہے اس عہد میں اندھا قانون

رنگ اور قوم کے جھگڑے سے بری ہو جو مشیر
کاربند اُس کے ہو تم ہے وہی اچھا قانون



حُسن

جانتے ہو بشیر کیا ہے حُسن
پرتوِ نورِ کبریا ہے حُسن

نرخ ہر شی کا اُس سے بڑھتا ہے
ہم سمجھتے ہیں کیمیا ہے حُسن

دل بے لوث و حُسن ہیں ہم جنس
اِس لیے دل کو کھینچتا ہے حُسن

اصل ہر شی کہ ہے وہی شاید
ذرّے ذرّے سے رونما ہے حُسن

عشق کا میرے اک کھلونا ہے
گر نہیں یہ تو اور کیا ہے حُسن

دل کو لیکر وہ چھوڑ دیتا ہے
بے نیاز اور خوش ادا ہے حُسن

کہتے ہیں بن گیا ہے ذرّوں سے
یعنی ترکیب کیمیا ہے حُسن

آسمان و زمیں اُلٹتا ہے
کون کہتا ہے واہما ہے حُسن

طور کو بھی جلا کے خاک کیا
یاالٰہی یہ چیز کیا ہے حُسن

جان دیتے ہیں ہم حسینوں پر
یہ نہیں جانتے کہ کیا ہے حُسن

سایہ سا اُس کے ساتھ رہتا ہے گُل پہ میرے مگر فدا ہے حُسن

کوہ و صحرا بھی اُس سے بچ نہ سکے میں کہونگا کوئی بلا ہے حسن

جس کو اچھا سمجھ لو اچھا ہے بس تخیل میں رہ گیا ہے حُسن

جانِ تازہ وہ بخش دیتا ہے دلِ کمزور کی دوا ہے حُسن

ٹکٹکی لگتی ہے اُسی کی طرف ہے نگہ کا وہ کہربا ہے حُسن

اُس کے ہر ہر ورق پہ لوٹے دل گُل کا واللہ دلرُبا ہے حُسن

آکے کشمیر میں ذرا دیکھو خس و خاشاک میں چھپا ہے حُسن

جب سے آیا ہے گلبدن میرا میرے گدیہ پہ چھا گیا ہے حُسن

رات دن اُس کو پوجتا ہے مشیر کوئی بت ہے کہ خود خدا ہے حُسن

جان دیتا اُسی پہ تو ہے مشیر
جس پہ خود ہی فریفتہ ہے حُسن

کشمیر سری نگر ۳۰ اگست ۱۹۱۱ء

ردیف (و)

(۱)

چھپا لیتی ہے نظروں سے کسی کے روئے تاباں کو
یہ اچھی دل لگی سوجھی ہے اس زلفِ پریشاں کو

پسند آیا ہے تم کو دل. مگر ہے پُر یہ ارماں سے
تمھیں لینا ہے تو پہلے نکالو دل سے ارماں کو

میں پہنچوں پتلیوں میں کھنچکے جادو یہ ہے آنکھوں میں
ہٹاتے ہو مگر تم جنبشیں دیدے کے مژگاں کو

سرورِ دل کی خاطر کیوں ہوں دختِ رز کا شرمندہ
میں اپنے دل میں رکھتا ہوں خیالِ چشمِ جاناں کو

برآئیں آرزوئیں تیری دل ہو فکر سے خالی
جو سونپ اپنے کو تو اُس عاجزوں کے میرساماں کو

ہمارے پاس ہے صرف ایک دل اُس کو کسے دیدیں
نگہ کو، ناز کو، عشوے کو یا اندازِ جاناں کو

جو بشتولی[۱] کے ویرانے میں وہ گلُ ہاتھ آجائے
تصدق میں کروں کشمیر کے سارے گلستاں کو

مشیر بے ریا ہر سمت پھیلی ہے ریاکاری
اُٹھاؤ رخت اپنا تم سنبھالو اپنے داماں کو

لہ شاعر کا ایک اُجاڑ گاؤں لکھنؤ سے صرف تین میل پر بالو۔ نالے۔ تنہائی۔ بے روک ٹوک ہوا۔ صاف ستھرا پانی۔ شاعر کی عزلت پسند طبیعت کے لیئے خاصکر موزوں مقام ہے



کشمیر سیری نگر (۲) ۲۶ ستمبر ۱۹۱۱ء

گرمی نہ ہو۔ بہار نہ ہو اور گھٹا نہ ہو
رندوں کو یاد تو کبھی تیری خدا نہ ہو

آزردہ دِل کشش سے مرا دلربا نہ ہو
یارب اثر نہ ہو جس میں وہ میری دعا نہ ہو

جوشِ جنوں کی روک ہے اچھی کبھی کبھی
میں آپ میں نہ آؤں اگر وہ خفا نہ ہو

ہنستا ہے گل بھی بلبلِ نالاں کے حال پہ
دل سب کے پاس ہے پہ دل مبتلا نہ ہو

ڈر جائے دل جو یاد سے روزِ حساب کی
حق تیری معرفت کا خدایا ادا نہ ہو

زینت ہر اک چمن کی ہے گل کی بہار سے
وہ حسن ہی نہیں ہے جو رونق فزا نہ ہو

پھر تو خدا ہی اُمّتِ آفت زدہ کا ہے
گر مہرباں رسولؐ شفیع الورا نہ ہو

اُلفت کا اقتضا ہے جو کرتا ہے ناز وہ
کیوں چاہو تم ہشیر کہ تم پر جفا نہ ہو

قیصر باغ لکھنؤ (۳) ۱۴ جنوری ۱۹۱۲ء

مشیر خوب اٹھا ہے فریب کھانے کو
سمجھ رہا ہے حیا اُن کے منہ چھپانے کو

لبوں کی گل کے ورق تک رسائی ہو کیونکر
ہزاروں خار کھڑے ہیں مزا چکھانے کو

لگایا رات کو دُنبالہ دار کاجل کیوں
جگایا آپ نے جادو یہ دل لُبھانے کو

لپٹ کے نکہتِ گُل سے نسیم آئی ہے
ہمارے دل کو کوئی خوش خبر سنانے کو

حنائے شوخ لگا کر وہ اپنے ہاتھوں میں
چلے ہیں آگ جلے دل میں پھر لگانے کو

وہ عذر خواہ کبھی ہوتے ہیں بے رخی پہ اگر
تو اپنے جوہرِ انصاف کے دکھانے کو

کسی کی زلفِ معنبر کی سنتِ شب نے
بچھا دیا ہے عجب جال دل پھنسانے کو

مٹے ہیں تیرے تبسم پہ کتنے غنچۂ گل
شگفتہ ہوتا ہے تو اور گُل کھلانے کو

دل و دماغ تو نذرِ حبیب کر بیٹھے
یہ آنکھیں رہ گئیں دریائے خون بہانے کو

غبارِ مغربیت[۱] اُٹھا ہے کس بلا کا مشیر
تمھارا نام و نشاں خاک میں ملانے کو

[۱] اسلام پر یورش کی طرف اشارہ ہے۔

قیصر باغ لکھنؤ (۴۲) مارچ ۱۲ ۱۹ء

مکیں کیوں ہو مکاں کیوں ہو زمیں کیوں ہو زماں کیوں ہو
جو فانی ہو عیاں کیوں ہو جو باقی ہے نہاں کیوں ہو

عدو بھی گر سُنے میری کہانی غم سے ہو بسمل
کہے ہمدرد سے جو حالِ دل میری زباں کیوں ہو

مجھے دنیا کے نیک و بد سے جب مطلب نہیں باقی
خیالِ دوستاں کیوں اور خوفِ دشمناں کیوں ہو

حسیں ایفائے پیماں کو خلاف وضع کیوں سمجھیں
شکن نخوت کی پیشانی پہ حُسنِ شاہداں کیوں ہو

میں ہوں آزادہ رو۔ دُنیا سبک ہے میری نظروں میں
گراں سر تاج سے جو ہو وہ مجھ سے سر گراں کیوں ہو

لکھا خط میں اُنھیں ہم نے غمِ دل۔ تو وہ لکھتے ہیں
ہمیں باور یہ درد انگیز تیری داستاں کیوں ہو

ہوائے گل نہ ہو مجھ کو اگر اس باغِ دنیا میں
مرے دل میں کھٹک کیوں ہو مرے لب پہ فغاں کیوں ہو

ہے پرتو جس کے جلوے کا ہر اک ذرّے سے آئینہ
الٰہی حسن ایسا سات پردوں میں نہاں کیوں ہو

کرشمہ مجھ کو دکھلاوے اگر اِنّی انا کا وہ[1]
تو پھر دل میں مسلمانوں کبھی عشقِ بتاں کیوں ہو

نہ ہو عالم میں کیوں شہرہ مری خالص محبت کا
نہ ہو جب راز ہی کوئی تو کوئی راز داں کیوں ہو

اُدھر آنکھیں اٹھیں بجلی اِدھر دل پر گری گویا
ادا و ناز سب کچھ ہو مگر وہ جاں ستاں کیوں ہو

مناسب ہے ہمارے واسطے رندی و بدمستی
جسے ہو زہد کا دعوے اُسے عشقِ بتاں کیوں ہو

[1] کوہ طور پہ حضرت موسیٰ جس جلوہ کو دیکھ کر غش کھا گئے اس سے یہی صدا نکلتی تھی۔

جلا دیتے ہیں برقِ حُسن سے وہ کوہ و صحرا کو
اگر ایسے حسیں سب ہوں تو پھر باغِ جہاں کیوں ہو
نہ لائے تابِ ضبطِ غم دل ایسا کیوں ہو سینے میں
کسی سے کچھ کرے شکوہ مری ایسی زباں کیوں ہو
روا رکھا ہے قتلِ بے گنہ تہذیبِ مغرب نے
مگر ایسا مہذب ساکنِ ہندوستاں کیوں ہو
مجھے تم سے محبت ہے تو مجرم اس سے کیوں ٹھہروں
تمھیں اُلفت نہیں مجھ سے تو نفرت مہرباں کیوں ہو
مشیرِ غم زدہ کوئی نہیں سنتا بیاں تیری
مگر غافل ترے غم سے نہیں بیکساں کیوں ہو

راہ گدیہ و لکھنؤ (۵) اپریل ۱۲ ۱۹ء

مرے دردِ محبت کی اگر کچھ ہے دوا تم ہو
مری موہوم ہستی کا اگر ہے مدعا تم ہو
ہوا وہ محوِ الفت جس سے تم سے لڑ گئیں آنکھیں
عجب جادو نظر تم ہو عجب کافر ادا تم ہو
مرے پہلو میں دل تھا شیشۂ نازک سے نازک تر
اُسے جانا ہے پتھر جس نے وہ نا آشنا تم ہو
تمھارا دم میں بھرتا ہوں مثالِ بلبلِ شیدا
ہے تم سے زینتِ گلشن گلِ رنگیں ادا تم ہو
مرے دل کی حکومت ہے مرے جسم و تخیل پر
مگر اُس دل کے اے جانِ جہاں فرماں روا تم ہو
کشش سے جو تمھارے حسن کی ہٹتا نہیں پیچھے
ٹھہرنا جو مرا دم بھر نہیں رکھتا روا تم ہو

مرے دل میں کبھی حرص و ہوس کا زور رہتا تھا
مگر اب کچھ نہیں اُس میں فقط اے دلربا تم ہو

بُرا ہو اس محبّت کا۔ بھلا ہو حُسنِ دلکش کا
میں اپنے آپ سے گُم ہوں مگر میرا پتا تم ہو

مجھے ویرانۂ عالم میں لطفِ خُلد حاصل ہے
اگر گُل فرحت اثر تم ہو۔ شمیمِ جاں فزا تم ہو

تمھیں کچھ بھی نہیں معلوم عقل و عشق کے جھگڑے
مرے رازِ دروں سے کس قدر ناآشنا تم ہو

مجھے کیوں ہو تعجب۔ گر تمھیں زاہد کہے کافر
خدا کا گھر یہ دِل تھا جس نے اُس کو ڈھا دیا تم ہو

جو میں پیشِ نظر آئینہ رکھ دیتا یہ کیوں سُنتا
ہمیں جس نے زمانے بھر میں رُسوا کر دیا تم ہو

مرا سر خسرو و خاقاں کے آگے بھی نہ جھکتا تھا
مگر اب پاؤں پر جس کے ہے وہ فرماں روا تم ہو

زمانے سے چلن اب اُٹھ گیا ایفائے پیماں کا
وفا میں اب تو یکتا اے حبیبِ باوفا تم ہو

ہوس کی جو گھٹائیں چھا گئیں تھیں ہو گئیں برہم
منور جس نے دل کو کر دیا وہ مہ لقا تم ہو

اندھیرا ہے۔ تلاطم ہے۔ ہوائے تند ہے لیکن
ہمیں ڈر اے محمدؐ کیا۔ ہمارے ناخدا تم ہو

نہ شوقِ جاہ و عزت ہے نہ فکرِ سیم و زر ہم کو
الگ ان سب بکھیڑوں سے مشیرِ بے نوا تم ہو

کشمیر — (۶) — جون ۱۹۱۳ء

دل دردآشنا نہ ہو۔ گل جاں فزا نہ ہو
یہ کچھ نہ ہو تو دہر میں کچھ اے خدا نہ ہو

دنیا میں جانور بھی بہت سے غیور ہیں
انساں پہ ہو تُف وہ اگر باحیا نہ ہو

گر جوشِ انتقام نہ ہو تو نہیں سہی
پر حیف ہے اگر عصبیت ذرا نہ ہو

آئیں وہ کھنچ کے دل کی کشش سے یہاں اگر
پاس رضائے یار ہوس سے سوا نہ ہو

آئیں وہ جذبِ عشق سے کھنچ کر اگر مجھے
اُن کا خیال اپنی ہوس سے سوا نہ ہو

اے یار جب یہاں ہمیں خلوت نہیں نصیب
آؤ چلیں وہاں کہ جہاں دوسرا نہ ہو

دُنیا میں دوست ہے نہیں بہتر کوئی مشیر
دُشمن پہ اُس کو جان کہ جو بادفانہ ہو
انساں سے اپنے عیب چھپا لو مگر مشیر
تدبیر اس کی کیا کہ خدا دیکھتا نہ ہو

کشمیر سری نگر (۷) ۱۹ ستمبر ۱۹۱۱ء

اگر انسان کے دل میں محبت کبریا کی ہو
تو اس دنیا میں کیوں خواہش اسے آبِ بقا کی ہو

کوئی مشکل نہیں ایسی کہ جو حل ہو نہیں سکتی
اگر ہمّت ہو انساں میں اگر رحمت خدا کی ہو

نہیں کوئی بھی بیگانہ ہے میرا نوعِ انساں میں
مرے دل میں محبت کیوں نہ سب خلقِ خدا کی ہو

خود اپنے دست و بازو جب کریں مجھ سے دغا بازی
تو پھر اوروں سے کیا اُمید اے ہمدم وفا کی ہو

مری تربت کو کیوں برباد تو کرتا ہے ٹھکرا کر
کوئی حد بھی تو اے ظالم ترے جور و جفا کی ہو

سبھی انسان ہیں جب ایک تو تفریق پھر کیسی
جہاں میں کیوں نہ عزت ایک سی شاہ و گدا کی ہو

اگر دُنیا نہ ہو اک خارزارِ رشک و بدعہدی
تو پھر کیوں جستجو سب کو گُلِ باغ وفا کی ہو

اگر ہو روح تیری اے مشیرؔ آزاد و باہمّت
تو پھر کس واسطے ہیبت تجھے زنجیر پا کی ہو



کشمیر سری نگر

۱۷ ستمبر ۱۹۱۱ء

ردیف (ہ)

بے وفا سے کیا امید رسم و راہ ہے بہت مشکل محبت کا نباہ
عشق کی پہچان ہے اے چارہ گر چشم پرنم ہو زباں پر آہ آہ
لاکھ کانٹوں کی خلش کا خوف ہے دل رہے گی گل کے مل جانے کی راہ
عشقِ گل میں چاہیے بس تاجِ گل تجھ پہ کچھ زیبا نہیں زریں کلاہ
ہم کو دیدہ و جھونپڑا کشمیر میں دوسروں کو ہو مبارک قصرِ شاہ
گر ہو آزادی سے رہنا دشت میں اس پہ صدقے ہند کے سو عزّ و جاہ

اپنے دل سے تم ستائش لو مشیر
چاہیے کب دوسروں کی واہ واہ

کشمیر سری نگر (۱) ۲۶ اگست ۱۹۱۱ء

ردیف (ی)

بھری اتنی مے الفت کی چھلکی دل کے ساغر سے
ٹپکتی ہے وہی بن بن کے آنسو دیدۂ تر سے

نہ بولو آ کے لیکن رحم کر جاؤ نظارے پر
کہاں تک دیدۂ عاشق نگاہِ ناز کو ترسے

سمجھ کر عاشق مژگاں اشارے کرتے رہتے ہیں
رگِ دل کو وہ اکثر چھیڑتے رہتے ہیں نشتر سے

نظر در پردہ جو پائے کا کلیں بڑھ بڑھ کے طالب ہیں
بچاؤں کس طرح دل آخر اس بے باک دلبر سے

جو ہمبر بوئے گل ہو اور ہوائی ہو جہاں نہ اپنا
طول اس سے گزر کر ہیں پہاڑوں اور سمندر سے

یہ گلگشت اور یہ چشمے یہ سبزہ اور یہ وادی

حبیب اپنا ہو پاس اپنے گھٹا چھا جائے اور برسے

جو آدم خلد سے نکلے تھے تو کشمیر میں آتے

کہ اس خطّے کا منظر کم نہیں جنت کے منظر سے

ملے کیوں کوئی جھک کر اُس سے جو ملتا نہ ہو جھک کر

ملو تم بھی کشمیری نواتن کر ستمگر سے



۱۹۵۸ء

کشمیر سری نگر (۲) ۲۰ اگست ۱۹۵۸ء

غیر کی طرح سے ظالم مجھے ناشاد کرے

شوخیاں کہتی ہیں یہ جور اب ایجاد کرے

زیر لب ہنس کے کہا مجھ سے بوقتِ رخصت

چھوڑ دے دل کو مرے پاس کہ تو یاد کرے

آئے مرنے پہ تو دم بھر کی اذیت کیا ہے

جس طرح چاہے مجھے قتل وہ جلاد کرے

یادِ گل دل میں کھلا دیتی ہے امید کے پھول

پاس بن بن کے خزاں کیوں اسے برباد کرے

اُن کا دل سنگ بنا اور مرا دل خون ہوا

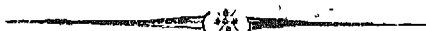
دل کو اب حسن اُدھر عشق اِدھر یاد کرے

فرق فردوس بریں سے نہ رہے کچھ باقی

آکے وہ حور جو کشمیر کو آباد کرے

۱۳۴

ہیں وہ خوش بیٹھ کے اغیار کی صحبت میں مشیر
یاد کیوں اُن کو تری آئے کہ نا شاد کرے



کشمیر سری نگر (۳) ۱۰ ستمبر ۱۹۱۱ء

ان کو غیروں پہ اگر لطف ذرا ہوتا ہے
دل کو یاں شکوۂ صد جور و جفا ہوتا ہے

عشق کی چوٹ سے دل ہار نہ دینا زنہار
درد بڑھ کے پھر آخر کو دوا ہوتا ہے

دور رہتا ہوں تو حسرت کے ستم ہیں دل پہ
پاس آنے سے جنوں اور سوا ہوتا ہے

عقل کھو جاتی ہے اور جان پہ بن جاتی ہے
دل کا آنا بھی عجب قہر و بلا ہوتا ہے

کہنے کو ہوتے ہیں دو قطرۂ خوں دل ہیں مگر
ایک طوفان قیامت کا بپا ہوتا ہے

ظلم کرتے ہیں وہ اور اس پہ بگڑتے بھی ہیں
دیکھو انداز نئی قسمت کا لکھا ہوتا ہے

دِل کو اُن آنکھوں کی زد سے ہے بچانا مشکل

قدر اندازوں کا کب تیر خطا ہوتا ہے

جز خدا ہم نہ تو رکھتے ہیں کسی سے اُمید

نہ کسی سے ہمیں دُنیا میں گِلا ہوتا ہے

مار کر زندہ کیا کرنے کا ہے شغل اُنھیں

حشر اُس کوچے میں ہر روز بپا ہوتا ہے

ایک نقطہ جو کبھی مجھ کو وہ لکھ دیتے ہیں

دلِ بیمار کو وہ نقشِ شفا ہوتا ہے

نام دُنیا میں چمکتا ہے ہمیشہ اُس کا

مُلک یا قوم پہ جو شخص فدا ہوتا ہے

وجد آتا ہے مجھے دیکھ کے منظرِ خوش

یا دِ کشمیر میں بس دل سے خدا ہوتا ہے

جستجو گل کی ہو تو خار بھی کھٹکینگے ہمیشہ
رہروِ وادیِ عشق آبلہ پا ہوتا ہے

[illegible]

کشمیر سری نگر　　　(۳۴)　　　۱۸ ستمبر ۱۹۱۱ء

دلِ عشاق بھی کیا قہر و بلا ہوتا ہے　　درد سے یاس سے حسرت سے بھرا ہوتا ہے

سوزِ پنہاں سے بھڑکا کرتا ہے دلِ عاشق کا　　برق سے آگ سے کس شے سے بنا ہوتا ہے

سارا عالم مجھے آتا ہے نظر ویرانہ　　وہ حبیب دلِ عاشق جو جدا ہوتا ہے

امتحاں ہوتا ہے دن بھر میں ہمارا سو بار　　اور ہر بار تشدد بھی سوا ہوتا ہے

ماہ و نجم ہو گر ہے دلِ عاشق خاور　　سوزِ خور ہی سبب نور و ضیا ہوتا ہے

کس کو دنیا میں میسر ہوئی راحت اے دل　　گلِ نازک بھی تو کانٹوں میں گھرا ہوتا ہے

قتلِ بے جرم سے باز آئیں وہ شیخ ابھی کیوں　　کافروں کو بھی کہیں خوفِ خدا ہوتا ہے

گفتگو عاشق و معشوق میں درکار نہیں　　عشق کا راز اشاروں میں ادا ہوتا ہے

دل کو یوں رام کیا ہے بتِ پرفن تو نے　　خون ہونے سے بھی راضی برضا ہوتا ہے

ہم نے مانا کہ وفا شیوۂ عاشق ہے مگر　　کبھی معشوق بھی پابندِ وفا ہوتا ہے

مجھ کو اے زاہدِ خود بیں نہ ہو تاکیدِ نماز　　دل میں وہ بت ہے وہی تو مرا خدا ہوتا ہے

دل مرا جلوہ گہِ ربِّ علیٰ ہے زاہد　　اس سے کچھ بڑھ کے بھی کعبہ میں بھرا ہوتا ہے

ہچکیاں دم بہ دم آتی ہیں تو کہتے ہیں مجھے
یاد کرنا بھی ترا ایک بلا ہوتا ہے

عاشقی ہی میں کٹی عمر مگر یہ نہ کھلا
پردۂ حسن میں کیا سحر چھپا ہوتا ہے

خلشِ رشک الگ آگ محبت کی الگ
دل عشاق بلاؤں میں گھرا ہوتا ہے

کوئی جادو ہے جو چل جاتا ہے دل پہ ہر روز
قد و قامت میں خط و خال میں کیا ہوتا ہے

اے رسولِ عربی ہاشمی و مطلبی
دیکھیے کب ہمیں پھر یادِ خدا ہوتا ہے

تم کو مجنوں نہ مشیرؔ اُن کی ادائیں کر دیں
رشکِ لیلیٰ پہ انھیں نامِ خدا ہوتا ہے

کشمیر سری نگر (۵) ۲۸ستمبر ۱۹۱۱ء

مجھے کیا لطف ہو اب گلستاں سے — کہ اک گل چن لیا باغِ جہاں سے

وہ باز آئے ہمارے امتحاں سے — کھلی خود دل کی ہار اُن کی زباں سے

پسند آیا ہمارا قلبِ وفا دوست — کہا دیکھیں یہ دل پایا کہاں سے

چھپا رکھا ہے مجھ سے دخترِ رز کو — یہ شکوہ ہے مجھے پیرِ مغاں سے

لگایا تاک کر کس نے نشانہ — ابھی آیا تھا اڑ کر آشیاں سے

انھیں افکار رہتے ہیں اسی کے — کہ واقف ہوں نہ ہم رازِ نہاں سے

نہ دیکھو مجھ کو تم تیوری چڑھا کر — لگا دو تیر کیوں ترچھی کماں سے

پلائی خود خدا نے گر نہیں مے — تو آیا نشہ آنکھوں میں کہاں سے

بستولی کا میدان اور برسات — ہمیں اتنا بہت ہے آسماں سے

اگر خواہش ہے آزادی کی تم کو — چلو لندن کو تم ہندوستاں سے

۱۹۱۱ء شاعر کے یہ تین بہت پرانے اشعار ہیں بستولی لکھنؤ کے پاس ایک گاؤں ہے۔ جہاں زمانہ تعلیم میں شاعر اپنے اعزا کے رہتا تھا

محمد ہو گئی اُمت پریشاں مدد کو آیئے باغِ جناں سے

ہے کم اُس کے لئے کیا عشق کا غم

خفا کیوں ہو شبیر خستہ جاں سے



کشمیر سری نگر | (۹۱) | ۲۸ ستمبر ۱۹۱۱ء

اُن کی صورت نظر نہیں آتی ‏ آرزو دل کی بر نہیں آتی

گیسوئے یار بڑھ گئے ایسے ‏ نظر اُن کی کمر نہیں آتی

بوئے گل ہجر میں نصیب کہاں ‏ کہ ہوا تک اِدھر نہیں آتی

اس مسافت سے جان ہاری ہے ‏ جلد اُن کی خبر نہیں آتی

حالِ دل اُن پہ کیا کریں اظہار ‏ بات تک ہم کو کر نہیں آتی

دردِ فرقت کا اور کیا ہو علاج ‏ موت اے چارہ گر نہیں آتی

پھرتی ہے گل کی شکل آنکھوں میں ‏ نیند یوں رات بھر نہیں آتی

باغِ جنت سے کم نہیں کشمیر ‏ مہک اُس گل کی پر نہیں آتی

دل کو کیا اختلاج ہوتا ہے ‏ بوئے گل اُس کو گر نہیں آتی

مدد اُمت کی اے رسول کریم ‏ حالت اچھی نظر نہیں آتی

دخترِ رز اور تیرا منہ بہ مشیر

چل وہ ایسے کے گھر نہیں آتی

کشمیر میری نگر (۶) ۹ ار ستمبر ۱۹۱۱ء

جبیبِ دلنشیں جب سے جُدا ہے
زمیں چلتی ہے یا سر پھر رہا ہے

جہاں دیکھو وہ مجھ پر ہنس رہا ہے
گُلِ نازک کی یہ بھی اِک ادا ہے

شرابِ تلخ کیوں مُنہ سے لگاؤں
تری آنکھوں نے متوالا کیا ہے

نگاہیں مست لغزش بھی قدم میں
تمھیں کہہ دو کہ یہ کیا ماجرا ہے

بلا سے جان اگر تن سے نکل جائے
مرا وہ جانِ جاں مجھ سے جدا ہے

بڑھے ہر دم ترا حسن اے شہِ حُسن
یہی تیرے فقیروں کی دُعا ہے

ڈراں مظلوم کی آہوں سے ظالم
خدا کا عرش ان سے کانپتا ہے
نہ جرأت ہے نہ آزادی کی خواہش
الٰہی قوم کی حالت یہ کیا ہے
بتا دو تم سبھی ہندی جوانو
کوئی ہمت گھٹانے پر بڑھا ہے
نہ اتنا زور کمزوروں پہ دکھلا
جو تجھ کو خواہشِ رحمِ خدا ہے
گرے گا جلد یورپ سر کے بل اب
غرورِ زور حد سے بڑھ گیا ہے
محمد آپ اُمت کی خبر لیں
کٹھن وقت اس کے سر پہ آ گیا ہے
گزاری عمر بے شغلی بتاں میں
شمیمؔ اب موقع یادِ خدا ہے

کشمیر سری نگر ۲۹ ستمبر ۱۹۱۱ء

جب بے گنہ کا خون بہانا شعار ہے
اچھا ہے ظالموں میں تمہارا شمار ہے
فرماتے ہیں وہ ڈال کے پہلو پہ اک نظر
یہ دل تمہارا ہے کہ ہمارا شکار ہے
پہلو پہ رکھ دو ہاتھ تلطف سے اے حبیب
سینے سے نکلا جاتا ہے دل بے قرار ہے
اے گل کمال حسن کی بیشک مثال تو
خوش تر پہ تجھ سے بھی وہ مرا گلعذار ہے
یا رب حرام خمر کا چھونا ہوا تو پھر
آنکھوں میں اُن کے کس لیے فطری خمار ہے
ہر لحظہ تیر دل پہ لگاتے ہو تم مگر
تم پہ ہزار جان سے پھر بھی نثار ہے

دریا و کوہ وادی و گلگشت و سبزہ زار
کشمیر میں عجیب مزے کی بہار ہے

یہ زرد زرد رنگ۔ ہوائیں یہ سرد سرد[1]
کشمیر کی خزاں میں بھی لطفِ بہار ہے

اُمید کیا فلاح کی ہندوستان کو
دور اس کے نوجوانوں سے حُبِّ دیار ہے

غصّہ میں آ کے خون بہانا نہیں درست
بڑھتی ہے قوم وہ جو ذرا بُردبار ہے

سرمستیاں وصال میں اچھی نہیں مشیر
گُل ہاتھ میں اگر ہے تو پاس اُس کے خار ہے

[1] کشمیر میں خزاں کے زمانہ میں بھی عجیب بہار ہوتی ہے پہاڑ کے پہاڑ بسنتی جامہ پہن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(۹) ۱۲ مئی ۱۹۱۲ء

راہ مری و میل

کہتے ہیں وقت رخصت از راہ بدگمانی
دل چھوڑ دے کہ رکھ لیں ہم تیری نشانی

گل کے ورق لب ان کے بار سیاہ زلفیں
کام ان کا دلستانی کام ان کا جانستانی

اوروں سے آپ میرا افسانہ سن چکے ہیں
ہیں جاں بلب ہو سن لیں اب تو مری زبانی

پیدا کیا خدا نے مارا بتوں نے مجھ کو
بس سرگذشت یہ ہے یہ ہے مری کہانی

یارب کبھی نہ وقفہ اس راز سے عدو ہو
بدتر ہے موت سے بھی میری یہ زندگانی

کیا کیا نہ راز کھلتے میری وصیتوں سے
خوش ہیں سبھی کہ مجھ کو موت آئی ناگہانی

اے غیب دان عالم مجھ کو بھی تو بتا دے
آئے گی کام کس دن میری یہ زندگانی

داغ گناہ میں نے ڈالے ہیں اپنے دل پر
لیکن یہ داغ حسرت ہیں کس کی مہربانی

قسمت میں یا الٰہی طوق گراں ہے کب تک
کب ہوگی ہم کو حاصل اپنے پہ حکمرانی

آئینہ تک مقابل رکھتے نہیں ہیں اب وہ
نخوت کی اس سے بڑھ کر ہوگی کیا نشانی

گل ہنس رہے ہیں تم پر اور میری عاشقی پر
گلشن میں آکے تم کو اب آگ سی ہے لگانی

ﮦ یہ شوق شاعر کے دل میں زمانہ طفولیت ہی سے ہے۔

اے محتسب قسم لے اپنے ہی تو لہو کی — چلّو میں کچھ نہیں ہے انگور کا ہے پانی

بلبل مشیر تیرے کس گلُ کی ہے محبت — کرتا ہے مثلِ بلبل تو یہ جو گل فشانی

نظمیں مشیر اپنی تم شوقؔ[1] کو دکھا لو

ہے شاعری میں اُن کی حسنِ نگار مانی

[1] اُستادِ وقت شیخ احمد علی قدوائی۔

راہ مری فی دو میل (۱۰) ۱۲ مئی ۱۹۱۲ء

کر دی نثار تم نے اُس بت پہ زندگانی — اچھی ہی خدا کی نعمت کی قدر دانی

گلشن سے دور ہوں میں گو مبتلائے گل ہوں — اے باغبان ہستی کیسی یہ باغبانی

اُس ماہرو[1] کو ہوگی پروائے نقد دل کب — دیکھی ہے مہر انور کی اس پہ زر فشانی

پھر کر دو پا کے مجھ کو بولے وہ رحم کھا کر — کیوں خاک میں ملا دی تونے یہ نوجوانی

دل میں نہیں ہے کچھ اب جز یادِ یار باقی — دینا انھیں پہ ہے پیغام یہ زبانی

کوئی بتا تو کس نے ننھا سا دل دکھایا — کیوں ہے یہ بے قراری کیوں ہے یہ جاں فشانی

ہندوستاں ہمارا جنت نظیر سارا — پھر بھی نہیں میسر یاں ہم کو شادمانی

بیدار یوں نہ ہوگی اب قوم گر ہماری — ہم صور پھونکدیں گے جی میں ہمنے ٹھانی

ہم بھی مزے کریں گے آزاد ہو کے اک دن — سن لے تو اے ستمگر الہام آسمانی

چل دو طرابلس[2] کو تم اے مشیر فوراً
شاید تمہیں ہو حاصل واں عمر جاودانی

[1] شاعر مع اپنے اعزا کے سفر کر رہا تھا کہ ایک بار آفتاب کا عکس سطح آب پر کچھ اس ترکیب سے پڑا کہ پانی کے قطرے ستاروں یا چاندی کی طرح چمک اٹھے۔ ایک عزیزہ نے فرمائش کی کہ اس نظارہ پر شعر ہو۔ شعر خود اُن کی تعریف میں ہو گیا "ماہرو" جس میں بھی ایک رعایت ہے۔ [2] طرابلس کی ترکی و اطالیہ کی جنگ کا اثر شاعر کے دل پر بے انتہا ہے

کشمیر سری نگر (۱۱) جولائی ۱۲ سنہ ۱۹ء

وہ بت اے خدا کیوں خفا ہو رہا ہے
یہ کیا امتحانِ وفا ہو رہا ہے

تجھی کو نہیں ہے ہوس گل کی بلبل
مرا دل بھی گل پر فدا ہو رہا ہے

انھیں پارسائی کا ہے زعم ایسا
اِدھر دیکھنا ناروا ہو رہا ہے

وہ خود تو ہیں دلشاد اُن کی بلا سے
کوئی مبتلائے بلا ہو رہا ہے

رقیبوں کے آنے کا ہے وقت شاید
وہ بے وجہ مجھ سے خفا ہو رہا ہے

میں آئینہ اُس کا نہ کیوں توڑ ڈالوں
کہ مغرور وہ خود نما ہو رہا ہے

نہ ایسے سے دل کو لگانا تھا تم کو
جو کچھ ہو رہا ہے بھلا ہو رہا ہے

مبارک ہو اُس بُت کو غیروں کی اُلفت
مرے دل کو خوفِ خدا ہو رہا ہے

میں پہلو سے دل کھینچ کر پھینک دوں گا
یہ غیروں سے کیوں آشنا ہو رہا ہے

نہیں دیتے ہیں خط کا بھی وہ جواب اب
یہ اُلفت کا وعدہ وفا ہو رہا ہے

بہت سو چکے اب تو چونکو خدارا
ذرا دیکھو دُنیا میں کیا ہو رہا ہے

رہیں ہر جگہ پست مشرق کی قومیں
یہ یورپ کو سودا نیا ہو رہا ہے

مشیر اب نہ لینا کبھی نام اُلفت
وہاں رنگ ہی دوسرا ہو رہا ہے

حُرّیت

اے اہل ملک! خوش ہو حُرّیت آرہی ہے
تسکین قلبِ مضطر وہ ساتھ لا رہی ہے
گھر گھر ہوا منوّر آئی وہ ماہ پیکر
دل میں ہر اک کے الفت اُس کی سما رہی ہے
جو جو غلام بن کر تھے مبتلا الم میں
طوقِ گراں سے گردن اُن کی چھڑا رہی ہے
آگاہ کر کے حق سے حق دے دیے ہیں سب کے
علم و عمل کا ڈنکا ہر سو بجا رہی ہے
ہر جھونپڑی میں روشن کر دی ہے اُس نے مشعل
دل میں نئی لگن وہ سب کے لگا رہی ہے

قومیت اور رنگت کے تفرقے مٹا کر
شیر و شکر ہر اک کو اب وہ بنا رہی ہے

اے رحمتِ مجسّم ہو آپ کو مبارک
اسلام کے اصولوں کو وہ سکھا رہی ہے

آزاد ہوں سب انساں حق سب کے ہوں برابر
یہ حکم عام اپنا سب کو سنا رہی ہے

یورپ اور ایشیا کے جھگڑے رہینگے کیونکر
شرق او رغرب کا فرق اب وہ مٹا رہی ہے

عادات مشرقی کو مغرب کا رنگ دیکر
تہذیب نو کا سکہ دیکھو جما رہی ہے

آزاد ہو گی اک دن خلقت خدا کی ساری
امید میرے دل کو اس کی دلا رہی ہے

وہ جرأت و حمیت کے جوش کو بڑھا کر
اخلاقِ قوم کو بھی بہتر بنا رہی ہے
مذہب سے اب تعصب تم سب نکال ڈالو
ہر قوم کو سبق وہ اب یہ پڑھا رہی ہے
اے آہوئے رمیدہ مجھ کو بھی ساتھ لینا
صحرا سے بھی تو بوئے حریت آ رہی ہے
ہوں عندلیب نالاں گل کی ہوس ہے مجھ کو
وہ بوئے گل بھی دیکھو گلشن سے لا رہی ہے
خوش ہو مشیرؔ تم تو آزاد ہو کے لیکن
کتنوں کے دل غلامی ابتک ستا رہی ہے

سری نگر (۱۳) ۲۴؍جون ۱۹۱۲ء

غزل فارسی

باغیرِ مے بنوشی والہ چہ پارسائی
جانم بہ غم بسوزی وہ وہ چہ مہ لقائی
اے دوست تا بنالم از کلفتِ جدائی
جانم رسید بر لب وقت است باز آئی
دل دادہ بغیرے با غیر آشنائی
خوں کردہ دلِ ما تو خوب دل ربائی
افسانۂ دلِ ما از دیگراں بگوئی
باغیر ہمنشینی۔ باغیر ہمنوائی
دل نقد خوب بودہ کردم نثار رویت
لیکن ندیدہ بودم جز جور بے وفائی

اے شوخ عشق چشمت دانی بہ من چہا کرد

دِل درد آشنا شد جاں نذر کج ادائی

مدہوش جام عشقم۔ از خود خبر نہ دارم

برپا جہاں تو کردی خوش خودنما خدائی

حالِ دلم کہ خوں شد از دیگراں چہ گویم

برمن حبیبِ من زد صد تیرِ کج ادائی

اے رحمتِ دو عالم برمن بکن نگاہے

مقبولِ دو جہانی۔ محبوبِ کبریائی

از گردنم جدا کن ایں حلقۂ غلامی

حریت جفا کش کے آئی تو کجائی

اے عندلیب از گل حالم چرا نہ گوئی

من بے نوا ہمشیرم تو مرغ خوش نوائی

قیصر باغ لکھنؤ (۱۴) ۱۹ نومبر ۱۹۱۱ء

یہ خطرہ[۱] مجھے بیگماں ہو رہا ہے — کہ اسلام اب بے نشاں ہو رہا ہے

مراکش گیا اور مٹا ملک ایراں — غضب کیوں یہ اے آسماں ہو رہا ہے

وہ بیمار[۲] مشہور جو سخت جاں تھا — صد افسوس اب نیم جاں ہو رہا ہے

ہر اک جا پہ بلقان میں کشت و خوں ہے — وہاں ہر بدن خوں چکاں ہو رہا ہے

نظر آ رہے ہیں وہ توپوں کے شعلے — کہ میدان آتش فشاں ہو رہا ہے

وہ مقتل ہے اسلام کے حامیوں کا — جہاں بحرِ احمر رواں ہو رہا ہے

بہم مل کے سینہ سپر ہوں مسلماں — کہ اب حملۂ جاں ستاں ہو رہا ہے

یتیموں کی فریاد جاں سوز سن کر — ہمیں بھی تو جینا گراں ہو رہا ہے

کہاں تک اٹھائے وہ صدمہ پہ صدمہ — دلِ مبتلا ناتواں ہو رہا ہے

کہاں سو رہا قافلہ کا نگہباں — کہ گمراہ اب کارواں ہو رہا ہے

[۱] یہ غزل زمانۂ علالت و زمانۂ آلامِ اسلامی کی ہے۔

[۲] ترکی

کہیں اب نہ بلبل نہ غنچہ نہ گل ہے گلستاں میں دورِ خزاں ہو رہا ہے
مشیر اب نہیں وقت غفلت کا باقی
بس اب آخری امتحاں ہو رہا ہے



گدیہ (۱۵) اپریل ۱۹۱۳ء

مشیرِ دل شدہ تیری یہ حالت ہوتی جاتی ہے
کہ تجھ کو دیکھ کر الفت سے نفرت ہوتی جاتی ہے

قیامت ڈھا گیئں بلبل یہ گل افشانیاں تیری
جسے دیکھو اُسے تجھ سے رقابت ہوتی جاتی ہے

تجھے کس ماہ وش سے اے دلِ مضطر محبت ہے
کتاں کے مثل اب کیوں تیری حالت ہوتی جاتی ہے

سُنا اغیار سے چرچا جو میرے عشق کا اُس نے
کہا اس عشق سے مجھ کو عداوت ہوتی جاتی ہے

خدا کے گھر پہ بھی اصنام قبضہ کرتے جاتے ہیں
ہر اک دل کو انھیں سے اب محبت ہوتی جاتی ہے

اُدھر حُسن جنوں انگیز۔ اِدھر عشق جنوں افزا
گھرا ہے دل بلاؤں میں مصیبت ہوتی جاتی ہے

تجھے کس مہ لقا کے زلف پیچاں کا ہوا سودا
یہ کیوں دیوانوں کی سی تیری صورت ہوتی جاتی ہے

کسی کے عشق میں محویت اپنی بڑھ گئی ایسی
کہ عالم کے مشاغل ہی سے نفرت ہوتی جاتی ہے

عیادت کو میری آیا مرا گل پیرہن شاید
کہ خوشبوئے گل نورس سے فرحت ہوتی جاتی ہے

کسی کو کیا بھروسا ہو کسی پر اس زمانے میں
کہ کمیاب زمانہ اب شرافت ہوتی جاتی ہے

یہ گلزار[1] حبیب دلربا مجھ کو غنیمت ہے
دل بیمار کو یاں کچھ تو راحت ہوتی جاتی ہے

[1] نام شاعر کے ایک باغ کا

کہاں یہ باغ یہ منظر یہ قادر[1] گنج کا ٹیلہ
پڑا رہنے دو یاں مجھ کو کہ صحت[2] ہوتی جاتی ہے

برا ہے یا بھلا گدیہ پھر آخر ہے وطن اپنا
زیادہ اس سے ہر دم میری الفت ہوتی جاتی ہے

مدد کو آئیے اے رحمت عالم ذرا جلدی
کہ نازک آپ کی امت کی حالت ہوتی جاتی ہے

نشان شوکت توحید آیا ہے جو مٹنے پر
مشیر اس عالم فانی سے نفرت ہوتی جاتی ہے

[1] شیخ غلام قادر جن کی سرکردگی میں کابل کے میدان میں قدوائیوں نے شاہ شجاع کے ساتھ اپنے ملک پر جان نثاری کی داد دی تھی، ان کے نام سے گدیہ میں ایک قلعہ اور ایک گنج آباد تھا۔ اب محض ایک ڈھیر ہے اور کچھ نہیں۔ یکسر بارہ سو قدوائی ایک ساتھ شہید ہوئے تھے

[2] شاعر کو کشمیر میں قلبی حرکت کے رکنے کے دورے شروع ہو گئے۔ گدیہ آکر کچھ افاقہ ہوا تھا۔ گو اس میں پھر ولایت جا کر بہت عرصے کے بعد کمی ہوئی۔

کشمیر سری نگر (۱۶) ۲۴ مئی ۱۹۱۳ء

ہند

اے ہند تیری الفت دل میں سما رہی ہے
کچھ کچھ ضرور تجھ میں رعنائی آ رہی ہے
علم و ادب میں تیرا کوئی نہ تھا مقابل
تاریخ تیرے قصّے مجھ کو سنا رہی ہے
اے ہند مجھ کو پیارا سارے جہاں سے ہے تو
تیری نرالی سج دھج دل کو لبھا رہی ہے
گو اجنبی سے اُلفت تو نے بڑھائی لیکن
دل میں مرے محبت تیری سما رہی ہے
رحمت خدا کی ہوگی اُس پارٹی پہ بیشک
زنجیر سے جو گردن تیری چھڑا رہی ہے

قوم فرنگ کا ہے اے ہند تجھ پہ احساں
حرفت کے راستہ وہ تجھ کو بتا رہی ہے

عاشق ہوئے ہیں تیرے پھر نوجواں ہزاروں
افسردگی پھر اب کیوں چہرے پہ چھا رہی ہے

پیدا کیے ہیں تو نے ہر ہر ہنر میں یکتا
جن کی ذکاوت اپنا سکّہ بٹھا رہی ہے

بنگالہ کی فراست کا غلغلہ مچا ہے
یورپ کی عقل کو جو نیچا دکھا رہی ہے

موجود تجھ میں ہیں اب وہ خوش بیاں مقرر
کوئل بھی جن کی خوبی کے گیت گا رہی ہے

ہے گوکھلے سے بہتر اے ہند کون لیڈر
دل کو ہر اک کے اس کی گفتار بھا رہی ہے

رابندرا سے شاعر او رشوق سے مخمور

تیری زمیں اب گل ایسے کھلا رہی ہے

وہ بمبئی کے تاجر جن کے مقابلہ سے

قوم فرنگ پر بھی دہشت سی چھا رہی ہے

تحریک وہ سودیشی بڑھ بڑھ کے آج کل جو

مغرب کے تاجروں پر رد وا جما رہی ہے

پنجاب کی وہ جنگی اقوام جن کی ہیبت

شیر ژیاں کے دل کو بھی اب ہلا رہی ہے

یہ سرزمیں اودھ کی زرخیز و عقل پرور

کیا کیا نئے شگوفہ اب یہ کھلا رہی ہے

ق

اک انجمن بنی ہے کعبہ کے خادموں کی

عز و وقار تیرا اب وہ بڑھا رہی ہے

مفلس کو بھی تونگر تو نے بنا دیا ہے
کھنچ کھنچ کے تیری دولت یورپ کو جا رہی ہے

تیرا ہی تو ہے لڑکا وہ بوس جس کے آگے
تہذیب مادی بھی سر کو جھکا رہی ہے

روحی صفائی تیری ایسی ہوئی ہے غالب
یورپ کو بھی وہ بندہ اپنا بنا رہی ہے

وہ دن گئے کہ ہندی آپس میں لڑ رہے تھے
اب تو وطن کی الفت سب کو بلا رہی ہے

اے ہند دلربائی تیری ہے روز افزوں
چہرے پہ تیرے رونق کیا خوب آ رہی ہے

قدرت کے منظروں سے دلچسپیاں جنھیں ہوں
بو صبا یہ اُن تک پیغام لا رہی ہے

ق

کشمیر میں ہوا ہے تفریح دل کا ساماں
بوئے گل و میوہ جنگل سے آ رہی ہے

اے اہل ہند سب کچھ موجود ہے یہاں پر
پھر کیوں نظر تمھاری یورپ کو جا رہی ہے

منزل سے چل رہا ہے اب قافلہ ہمارا
بانگ جرس برابر گِریہ سے آ رہی ہے

ہاں اے مشیرؔ دیکھو مشعل وہ بجھ نہ جائے
ظلمت میں راستہ جو سب کو دکھا رہی ہے

سری نگر (۱۵) ۱۴ اگست ۱۹۱۳ء

مشیرِ زار سرگرمِ فغاں ہے
یہیں گُل کی محبت کا نشاں ہے

یہ کیوں حرص و ہوس شور و فغاں ہے
جو کافی زندگی کو نیم ناں ہے

فقط ہے نامہ و پیغام باقی
وہ لطفِ ہم نشینی اب کہاں ہے

وہ گُل ہے جس کے دل میں جلوہ آرا
نگہ میں اُس کی کیا حورِ جناں ہے

نظر میں کیا ہے اب فتحِ دو عالم
وہ کیوں جوڑے ہوئے تیر و کماں ہے

کہاں جائیں خدایا بچ کے اب ہم
کہ سرگرمِ تظلّم آسماں ہے

کیا کس کو ستم گر نے تہِ تیغ
یہ کس کے خون کا دریا رواں ہے

ترے عاشق کو یکساں خلد و دوزخ
تپِ الفت سے جلتا یہ جہاں ہے

کیا ملت پہ جس نے جان قرباں
مشیر اُس کو عمرِ جاوداں ہے

چراغِ گل شدہ بر لوحِ سادہ
یہی بس اب نشانِ بے نشاں ہے

وہ گُل بُلبل کا نغمہ سُن کے بولا
کہاں میرا مشیرِ خوش بیاں ہے

سری نگر　　　　(۱۸)　　　　۲۱ اگست ۱۹۳۶ء

بیکس مشیر سے وہ دعا صبح و شام لے
گرتے ہوئے کو جو نہ اٹھا کے تھام لے

غفلت سے جو خودی کی [illegible]
پھر کیوں کسی سے خون کا وہ اہتمام لے

سفاک یوں نہ [illegible]
وہ ظلم نہ تجھ سے کہیں انتقام لے

فیاض وہ ہے بخش دے جو سب کچھ اپنا
نے طالب صلہ ہو نہ اجرت و دام لے

دل چھین کر زبان بھی عاشق کی کاٹ دی
تاکہ نہ عاشقی کا وہ دلدادہ نام لے

اس عالم ظہور کی حالت کھلی تو کیا
روشن جو دل کا حال کرے تو وہ جام لے

غافل ہیں لوگ اپنے فرائض سے اے مشیر
تو نشتر سخن سے ذرا اپنا کام لے

سری نگر (۱۹) ۲۲ر اگست سنہ ۱۹۱۳ء

شاعر سے خطاب

ہے زمیں شور، سخنور! تو گلستاں کر دے
ریزۂ سنگ کو بھی ماہ درخشاں کر دے

یاس کے ابرِ سیہ کو تو ہٹا دے سر سے
مہرِ امید کو تو خوب نمایاں کر دے

آئنہ دل کا مجلّا و مصفّا ہو جائے
چشمِ تاریک کو بھی شمعِ شبستاں کر دے

ظلم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے فوراً
دلِ ناترس کو تو خوف سے لرزاں کر دے

زندگانی میں پھر آ جائے حلاوت تازہ
غم کے لشکر کو بھی تو بے سر و ساماں کر دے

ہوگئی ہے تنِ لاغر کو دوا سے نفرت
جسم صد زخم کو منت کش درماں کر دے
دل حاسد کے لیے تیرا قلم ہو برچھی
سامنے ہو جو دوا سنا اس کو نمکداں کر دے
منکشف کر دے تو حالِ دل ہر عربدہ جو
جو ہیں خود بین و خود آرا انھیں حیراں کر دے
تیرا ہر شعر فصاحت کا نمونہ بن جائے
روستا کو بھی سخن تیرا زباں داں کر دے
ہاں اگر زور ہے اشعار میں تیرے شاعر
قوم کو ہند کی بہبود میں کوشاں کر دے
دل نشیں کر دے ہر ایک کے صفت جود و کرم
یعنی دنیا میں ہر اک کو تو مسلماں کر دے

نقش تو کلمۂ توحید کو کر دے دل میں
اور تثلیث کے دفتر کو پریشاں کر دے
شعبدۂ جبر و خودی کو تو فنا کر دے مشیرؔ
ان درندوں کو بھی تہذیب کے تو انساں کر دے

خونِ ناحق تو چھپائے سے نہ چھپے گا قاتل
لاکھ لاشوں کو گناہوں سے تو پنہاں کر دے
تنگ کر پائیں اگر میرا گل اندام کبھی
پھر سے اس کلبۂ احزاں کو گلستاں کر دے
کشمیر میں کیا دل کو لگا بیٹھے مشیرؔ
اس کو تو وقفِ خیالِ رخِ جاناں کر دے
ایسا کر تو کسی قسم کا ایجاد مشیرؔ
من و عن دل کی جو حالت کو نمایاں کر دے

سری نگر صبح — ۱۳ اگست ۱۹۶۱ء

قلم

(۲۳)

مرض مجھ کو لکھنے کا جب سے ہوا ہے — مرے درد کی اے قلم تو دوا ہے

تری نوک اے کلک نشتر ہے لیکن — مجھے اس نے مرہم بھی اکثر دیا ہے

جیب سال و دل میں جو فاصلہ تھا — قلم کی بدولت بہت کچھ گھٹا ہے

ہر اس قدر ہے وہ تسکین خاطر — کسی کے قلم سے جو نامہ ملا ہے

سیاہی میں تیری ہے کیا روشنائی — کہ اس سے منور جہاں ہو گیا ہے

زبان بشر ہو گئی جب سے قاصر — تو اس کا بھی تو کام کرنے لگا ہے

خیالات پاکیزہ کو اس جہاں میں — قلم عمر جاوید تو بخشتا ہے

زمیں کی طنابیں بھی کھینچی ہیں تو نے — کہ شرق اور غرب ایک تو نے کیا ہے

صحائف ادھر کے ادھر جا رہے ہیں — یہ امداد سے تیری ممکن ہوا ہے

قلم تو ہے افزائش روح انساں — اضافہ تمدن میں تجھ سے ہوا ہے

عرب کے وہ اہلِ قلم جن سے یورپ　　ابھی تک سبق پر سبق لے رہا ہے

وہ یونان اور ہند کے فلسفی بھی　　قلم ہی سے اُن کا بھی شہرا ہوا ہے

وہ نامہ نگارانِ اخبار جو ہیں　　زمانہ میں ہنگامہ جن سے بپا ہے

پہونچتے ہیں ہر رزم اور بزم میں وہ　　ق قلم اُن کی تلوار - اُن کا عصا ہے

زبانِ بشر ہے خدا کی بنائی　　مگر اُس سے تیرا اثر دیرپا ہے

چلاتے تھے جو تیر و شمشیر و خنجر　　اُن ہاتھوں پہ بھی اب تو قبضہ ترا ہے

دلوں میں اُتر جاتی ہے نوک تیری　　نہ پہونچی جہاں تیغ تو جا رہا ہے

کہاں زور تیرا سا تلوار پائے　　بہت دور سے کام تو کر سکا ہے

یہ مانا کہ ہے زیرِ شمشیر جنت　　پہ شمشیر پر خود ہی سایہ ترا ہے

یہ دیکھا ہے ہم نے کہ شمشیر بھی اب　　وہی کرتی ہے جو کہ تو چاہتا ہے

مقابل میں توپ و تفنگ آئینگے کیا　　ترا زور دنیا میں سب سے سوا ہے

قلم میں یہ خوبی بھی دیکھی ہے ہم نے　　وہی زخم کاری کا مرہم بنا ہے

وہ دل جو کہ تلوار سے مضطرب تھے　　قلم نے دلاسا انھیں بھی دیا ہے

بُرا کیا ہو گر تیغ دنیا سے جائے — بہت قیمتی خون اُس نے پیا ہے

قلم ہاں سلامت رہے تا قیامت — کہ خدمت وہ انسان کی کر رہا ہے

قلم کا رہے بول بالا خدایا — زمانہ میں امن اُس سے بپا ہوا ہے

مشیر آپ اپنا قلم پھر سنبھالیں — پھر اب کام کا اُس کے وقت آگیا ہے

یہ کیا ہو گیا ہے تمھیں اے مشیر اب — قلم کی جگہ ہاتھ میں گل لیا ہے

قلم ہاتھ سے چھوڑنے کی سزا ہے
کہ شمشیر[1] سے سر قلم ہو گیا ہے

[1] شمشیر کا "شر" نکالنے سے "مشیر" رہتا ہے

۳۰ اگست ۱۹۷۳ء

سری نگر ۶ و ۷ بجے صبح

(۲۱)

سچ

مجھ کو اس دہر میں ہر چیز سے پیارا سچ ہے
زندگی کا مری دنیا میں سہارا سچ ہے

ایک کے آئیں مقابل میں ہزاروں لیکن
فتح اُس سمت ہے جس سمت صف آرا سچ ہے

کوئی حاجت نہیں ملبوسِ مُطلّا کی اُسے
گلِ تازہ سا خوش انداز و خود آرا سچ ہے

لاکھ ہو زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر کڑوا
میری خوگر ہے زباں مجھ کو گوارا سچ ہے

خود بخود ہوتی ہے انساں کی طبیعت مائل
واہ کیا خوب دل آویز و دل آرا سچ ہے

خاک کر دیتا ہے باطل کو جلا کر دم میں

برق جوّالہ کے مانند شرارا سچ ہے

مصلحت بینی مبارک ہو تمہیں اہل فرنگ

جو انا الحق کہے سولی پہ ہمارا سچ ہے

بحر احمر میں بھی ڈوبے نہ زبان حق گو

غرق ہو کر بھی جو لیتا ہے ابھارا سچ ہے

صاف تلوار کے منہ پر بھی کہیں گے ہم سچ

سچ تو یہ ہے ہمیں تو جان سے پیارا سچ ہے

لے لیا خالق مطلق سے ہمیشہ کے لیے

جس نے بخشا کشتی ماہی کا اجارا سچ ہے

تم اکیلے تھے مقابل میں تھا اک عالم

جس نے غالب کیا تم کو وہ تمہارا سچ ہے

۱۳ ستمبر ۱۹ء

مری گوہر

"عورت"

(۲۲)

جنس نازک ہے ہر اک دل میں محبت تیری
وہ بشر ہی نہیں جس کو نہ ہو الفت تیری

جنس نازک کا لقب تجھ کو ملا ہے اس سے
دل کو ہر شخص کے بھاتی ہے نزاکت تیری

حور دنیا میں جسے دیکھنا ہو تجھ کو نظر
اے گل اندام وہ بس دیکھ لے صورت تیری

نہیں بیجا ہے تجھے ایثار مجسم کہنا
ہر ادا سے تیری ظاہر ہے شرافت تیری

دوسروں کے لیے ہوتی ہے حریف تکلیف
اور کیا بڑھ کے ہو اب اس سے شجاعت تیری

کم سنی میں بھی نہیں ہوتی ہے فرصت دم بھر
گھر کے سب کام اُٹھا لیتی ہے طاقت تیری
شوہروں کے لیے مونس نہیں تجھ سے بڑھ کر
رنج و غم اُن کا بٹا لیتی ہے ہمّت تیری

اور اولاد کی تو روحِ رواں ہے تو ہی
دودھ بن بن کے ٹپکتی ہے محبت تیری
صبر اور حلم کی دیوی تجھے کہنا ہے روا
مشکلیں کتنی اُٹھاتی ہے نزاکت تیری
ساتھ دیتی ہے سبھوں کا تو بُرے وقتوں میں
باعثِ راحتِ خاطر ہے رفاقت تیری
تیرے ہی دم سے یہ آباد ہوا ہے عالم
چاہیے سب کو ہے اک قدر حفاظت تیری

خونِ دل اپنا پلاتی ہے تو ہر بچہ کو
باعثِ قوتِ عالم ہوئی قوت تیری

رکھ دی خالق نے ترے قدموں کے نیچے جنت[1]
اس سے اب بڑھ کے کرے کیا کوئی عزت تیری

تجھ کو اتنا نہیں سمجھا تھا کسی مذہب نے
جیسی اسلام کے باعث ہوئی عظمت تیری

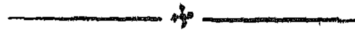
اور قوموں کے دلوں میں بھی تری الفت تھی
پر مسلماں پہ ہوئی فرض اطاعت تیری

ماں کی عزت کو بڑھایا ہے مسلمانوں نے
یوں تو تھی نفس کی خاطر سے عبادت تیری

اور چیزیں بھی ہیں دنیا میں خوش انداز و حسین
دل و جاں لیتی ہے ہر گل سی نفاست تیری

[1] الجنت تحت اقدام الامہات

تیرے اوصاف ہیں دونوں ہیں یہ مقبول مشیر
ہے وہ ایثار کہ سیپے لوٹ محبت تیری



سری نگر — ۲۵؍ اکتوبر ۱۹۱۳ء

"یارب توئی"

مالکِ ہر دو جہاں یارب توئی — خالقِ کون و مکاں یارب توئی

رحم کُن بر خاکسارانِ جہاں — دستگیرِ بیکساں یارب توئی

رزقِ ہر نیک و بد است از دستِ تو — غمگسارِ این و آں یارب توئی

نفسِ امّارہ کند میلِ گناہ — جرم بخشِ عاصیاں یارب توئی

نے دل و نے دیدہ دارد زینہا — ہر کہ گوید بے نشاں یارب توئی

مظہرِ ذاتِ تو شد ایں کائنات — مصدرِ روح و رواں یارب توئی

حُسنِ ظاہر پرتوے نورِ تو ہست — دل ستانِ عاشقاں یارب توئی

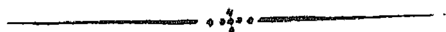
"اھدنا" یارب صراط المستقیم — وارثِ ہر خستہ جاں یارب توئی

گُل ز تو شد دلربا و جاں فزا — بوئے خوش در بوستاں یارب توئی

خاکداں را تو گلستاں کردئی — ہر چمن را باغباں یارب توئی

شد وقلم جائے قیام تو اللہ　　خلق گوید لامکاں یارب تو ئی
در امانش دار از ظلم و جفا　　حافظِ ہندوستاں یارب توئی

مصطفٰے را جانِ خود گوید مشیر
باز گوید جانِ جاں یارب توئی



کشمیر ~~~~~~ ١٩١١ء

عرضِ حال بجناب سرورِ کائنات رحمۃ للعالمین صلعم[1]

عاجز نواز تم پہ دل و جاں نثار ہے ۔۔۔ مصروفِ عرضِ حال یہ خدمتگذار ہے

تم سرورِ دو عالم و سردارِ دو جہاں ۔۔۔ پھر بھی تمھاری اُمتِ مرحوم خوار ہے

بیٹھے ہو جا کے خلد میں یا سیّدِ امم ۔۔۔ حالت یہاں ہماری تباہ و نزار ہے

تدبیر اب ہمارے سنبھلنے کی کیا رہی ۔۔۔ فاروقِ اعظم اور نہ وہ یارِ غار ہے

جھٹکا لگا ہے وہ کہ زمیں پر گرے ہیں ہم ۔۔۔ سر ٹھوکروں سے سنگِ سرِ رہ گذار ہے

اعدا نے تیر تاک کے ایسے لگائے ہیں ۔۔۔ جن سے جگر بھی خستہ ہے دل بھی فگار ہے

سب خانہ جنگیوں میں گیا زورِ قوم کا ۔۔۔ باقی نہ اب وہ شان نہ وہ اقتدار ہے

حلقے میں دشمنوں کے اکیلے گھرے ہیں ہم ۔۔۔ دلسوز کوئی ہے نہ کوئی غمگسار ہے

مفلس ہیں بے ہنر ہیں نہ دولت نہ علم ہے ۔۔۔ احوال اپنا قابلِ صد انتشار ہے

[1] سنہ ١٩١١ء میں یہ عرضِ حال جنگ طرابلس و بلقان پر کہی گئی تھی۔ دو تین اشعار سنہ ١٩١٣ء میں اضافہ ہوئے۔

وہ لوگ کیا ہوئے جو یہ کہتے تھے فخر سے — اسلام تیرے نام پہ سب کچھ نثار ہے

کیا مال ہیں نہ اور جواہر کہ جان تک — قربان بہرِ فرازیِ قومی وقار ہے

یادِ عروج و شانِ گزشتہ ہے رات دن — ماتم ہے غم ہے سوز ہے دل سوگوار ہے

باغِ مراد پر ہوا بادِ خزاں کا دور — جو تھا گلِ نشاط وہ اب مثلِ خار ہے

دل مضطرب و داغ کو بے کل جگر میں درد — حالت پہ اب ہماری جہاں اشکبار ہے

نرغہ ہے دشمنوں کا ہجوم ہراس بھی — سینہ ہے پاش پاش کلیجہ فگار ہے

مٹنے لگا ہے عظمت و ثروت کا ہر نشاں — عزت نہ رہ گئی ہے نہ قومی وقار ہے

اوصاف ہم میں کوئی بھی باقی نہیں ہیں اب — عثمان سا نہ خلق نہ وہ انکسار ہے

وہ دبدبہ وہ صولت و حشمت ہے زیرِ خاک — دلسوز اب تو ایک چراغِ مزار ہے

وہ ولولہ وہ جوش وہ جرأت نہیں ہے اب — اسلام ایسی قوم سے خود شرمسار ہے

آپس میں رحم ہے نہ مروت نہ اتفاق — کیا اے رسول تم کو بھی اب ہم سے عار ہے

اچھے ہیں یا برے ہیں تمھارے غلام ہیں — منسوب تم سے ہیں یہ بڑا افتخار ہے

طوفان ہے ابر و باد ہیں گرداب ہے مگر — بیڑے کی ناخدائی کرو تم تو پار ہے

اے سونے والے خاکِ مدینہ کے جاگ جاگ — پھر قوم رہنمائی کی اُمیدوار ہے

چاروں طرف سے گھیر لیا دشمنوں نے پھر — درکار شیرِ حق کی وہی ذوالفقار ہے

خشکی پہ جس نے ناؤ چلائی تھی یکبار — یاد آتی اُس کی آج ہمیں بار بار ہے

آجائے پھر وہ روح کہ تڑپا جس سے جہان — وہ جان جس پہ زور کا دار و مدار ہے

اُمت ہیں ہم تمہاری تم اللہ کے حبیب — موقوف تم پہ مرحمتِ کردگار ہے

باندھو کمر شفاعتِ اُمت پہ یا رسول — وہ مانے یا نہ مانے اُسے اختیار ہے

حرمت حرم کی ہم سے ہو گر ہم نہیں تو پھر — کعبہ بتوں کا گھر عرب اُن کا دیار ہے

وحدت کا طبل کون بجائے گا پوچھ لو — تم کو نصیبِ قربتِ پروردگار ہے

کس کو ملے گی خدمتِ بیت الحرم پھر — ہم سے زیادہ کس پہ اُسے اعتبار ہے

جان اپنی اُس کے نام پہ صدقے کریگا کون — وہ کون ہے کہ موت جسے خوش گوار ہے

سینے میں کس کے قوتِ وحدانیہ ہے وہ — دُنیا کے سارے زور پہ جو زوردار ہے

یورپ سے ایشیا کو بچائے گی کون قوم — تلوار کس کے ہاتھ میں نصرت شعار ہے

اُس ظلم سے جہان کو کر دیگا کون پاک — بڑھ بڑھ کے جو زمانے کو ناگوار ہے

"رحمت" لقب تمہارا ہے پہنچو مدد کو تم	مٹ جائے ہر جگہ جو بپا خلفشار ہے
اُمت پہ اب تمہاری نگاہیں جہاں کی ہیں	اس واسطے تمہاری ہی پھر اب پکار ہے
توحید کا علم ہو بلند اے رسول پھر	تثلیث سے مقابلہ پھر ایک بار ہے
پھر کوہ اور دشت اُسی کلمے سے گونج اٹھیں	جس میں جلالِ حضرتِ والا تبار ہے
پھر اتفاق و علم سے مضبوط ہو یہ قوم	اسلام کو زمانے میں جو انتظار ہے
یکدل ہوں یک زباں ہوں مسلماں جہاں میں پھر	مٹ جائے تا کہ قوم کو جو اضطرار ہے
کچھ موت زندگی کی نہ پروا ہمیں ہو پھر	دیں راہِ حق میں جان کہ قومی شعار ہے
نخوت کا نام لے نہ کوئی پھر جہان میں	وہ سر بھی آئے خاک پہ جو تاجدار ہے
پھر قوم کے دلیر نظر آئیں سر بکف	میدان پھر وہی ہو وہی کارزار ہے
پھر آئیں افسری کے لیے خالد و ضرار	پھر ہم پہ فتحِ روم کا سودا سوار ہے
بلقان میں نصیب ہو نصرت اُنہیں اب	اسلام کے وقار کا دارومدار ہے
مل جل کے سب بنائیں ہزاروں جہاز ہم	اب سطحِ آب ہی پہ اگر گیر و دار ہے
مل جل جہاں میں پھر وہی مچ جائے ایکبار	اب تک ہمارا ایک الم میں جو یادگار ہے

زیرِ علم ہو مشرق و مغرب کی سرزمیں
یہ آرزو ہے شبیر کی لیل و نہار ہے

اِسلام اور نامِ محمدؐ رہے بلند
جب تک کہ اے خدا یہ جہاں برقرار ہے

ذیل کا خط یوسف علی صاحب کو مہراج گنج ضلع رائے بریلی سے نومبر ۱۹۲۰ء
میں بذریعہ ڈاک بھیجا گیا تھا۔ اور ۱۹۰۶ء میں جب شاعر کے دوست شیخ
عبد القادر صاحب قسطنطنیہ میں اُس کے ساتھ تھے تو اتفاق سے اُس کا
مسودہ نظر آگیا جس کو اُنھوں نے بہت اصرار سے لیکر اپنے رسالہ
مخزن لاہور میں چھپوا دیا اس لیے کہ ان کو اس کا مضمون بہت پسند آیا
اب جبکہ عدم موالات اور ترک ملازمت کا شہرہ ہو رہا ہے شاعر کے
بیس برس اُدھر کے خیالات کی اشاعت بیجا نہ ہوگی۔ اس زمانہ کے
کچھ ہی عرصہ بعد شاعر ملازمت سے مستعفی ہو کر ولایت چلا گیا تھا۔ اور
اس طرح اُس نے اُسی زمانہ میں عدم تعاون کیا جب کسی اور کو اس کا خیال بھی نہ تھا

خط

یوسف تم کو لکھوں تو کیا ہو؟ بگڑو۔ بیزار ہو۔ خفا ہو

القاب "مکرمی" ہے کافی آداب۔ "دعا" خلوص دل کی

حالت اپنی تمھیں لکھوں کیا ہاں پوچھوں تمھاری خیر سلا

معلوم نہیں کہ حال کیا ہے — مجھ سے تمہیں کچھ ملال کیا ہے؟
کیا عیش و طرب میں مجھ کو بھولے — یا عزم سفر پہ میرے روٹھے؟
تم نے جو لکھا وہ سب بجا ہے — پر کیا کہوں حال میرا کیا ہے
عاجز اس نوکری سے میں ہوں — اے کاش نجات اس سے پاؤں
موقوف اسی پہ کچھ نہیں ہے — عزت کی بھی چاکری کہیں ہے
سمجھو ہے ملازمت غلامی — دونوں میں ہے سخت پائے بندی
آزادی دل کی جو ہے نعمت — ہو جاتی ہو اس میں آ کے رخصت
پھر کیا ہو یہ خاک مجھ کو مرغوب — حاشا کہ مجھے نہیں یہ مطلوب
خوش وقت کہ بیڑیاں یہ ٹوٹیں — ہم قید سے اس کی جلد چھوٹیں
منظور رہا وطن بھی ہونا — تھوڑے دنوں گھر کا رونا رونا
منظور فراق اقربا ہے — اس درد کی گر یہی دوا ہے
احباب کی بھی جدائی منظور — کر لیں سب بے وفائی منظور
منظور وہ صحبت اجنبی ہے — غربت کی گوارہ بے کلی ہے

مجھ کو وہ برد و برف منظور کلفت منظور۔ صرف منظور
منظور نہیں ہے پر غلامی عاری مری جان اس عاری
تم جی میں کہو گے بات کیا ہے اس شخص کو کیا یہ ہو گیا ہے
لیکن ذرا دل میں غور کر لو انصاف کو تھوڑی سی جگہ دو
گر ایک ہرن پکڑ کے پالو یا جانور اور ہی کوئی ہو
اس کو تم نعمتیں کھلاؤ شربت بھی قند کا پلاؤ
ٹھنڈا ٹھنڈا مکاں بنا دو سونا چاندی اسے پہنا دو
رکھو اسے تم ہزار دل سے آرام کا سب خیال کر کے
لیکن پھر بھی وہ خوش نہ ہوگا اور چاہے گا مخلصی ہی پانا
گر قید میں ہیں تو عیش و راحت ہے جانوروں کو بھی قیامت
آزاد ملے انھیں جو رہنا فاقہ۔ لو۔ دھوپ ہو گوارا
جب قید میں جانور ہوں بسمل انسان کا اس میں کیا لگے دل
اے دوست یہی ہے بات سچ ہے شوق سفر کا دل میں میرے

ورنہ کیوں زحمتیں اٹھاتا — لندن کا خیال بھی نہ لاتا

تم کہتے ہو شوق سیر و عشرت — لے جانے میں کر رہا ہے عجلت

الفت کسی نازنیں صنم کی — دل میں بے شبہ ہے سمائی

اور اُس کی ادائے بے حجابی — ہے تم کو اشاروں سے بلاتی

پیغام اُدھر سے کوئی لایا — لندن کی بہار پہ دل آیا

چلتی ہیں ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی — آتی ہیں گھٹائیں کالی کالی

پڑتی ہے پھوار تھوڑی تھوڑی — کیسی ہے وہ خوب چھاؤں اچھی

خوش شکلوں کے جمگھٹے ہیں — اور لوگ شراب پی رہے ہیں

گھونگر والے وہ بالوں والے — فیشن جن کے نئے نرالے

باریک کمر ملیح صورت — سرخوشی شراب عیش و عشرت

صحبت میں کشش ہے خوبرُوؤں کی — تم کو جانے کی ہے جو جلدی

یا ہند سے ہو گئے ہو بیزار — ہر دشت کی مثل اب ہے گلزار

خواہش اس سے نکلنے کی ہے — دھن تم کو سفر کی ہو گئی ہے

پڑھنے کا تو کرتے ہو بہانہ ۔ لیجائے گا تم کو آب و دانہ
جو جو یہ خیال ہیں تمہارے ۔ کوسوں ہیں دور راستی سے
یاں کس کو ہے شوق سیر و تفریح ۔ یاں ہے ہوس صلوٰۃ و تسبیح
جاں سوکھ گئی ہے درد و غم سے ۔ چھلنی ہوا ہے جگر الم سے
سامانِ طرب و عیش کیا ہو ۔ دل ہی جب غم میں مبتلا ہو
باور کرو اس کو یار میرے ۔ خالی ہوا ہے یہ دل ہوس سے
ہاں شوق ضرور اس قدر ہے ۔ دل سے لگی بات یہ مگر ہے
دنیا میں رہیں تو کام کر کے ۔ دنیا چھوڑیں تو نام کر کے
کچھ کام کسی کے ہم بھی آئیں ۔ آئے ہیں تو کچھ تو کر کے جائیں
زحمت تھوڑی اٹھا کے دیکھیں ۔ قسمت کو آزما کے دیکھیں
ہمت جو ہم رہِ سفر ہے ۔ آخر میں وسیلۂ ظفر ہے

بس ہو گیا ختم اُس کا مطلب
رخصت چلو ہوتا ہے مشیر اب

November 1905
127, SUTHERLAND AVENUE,
LONDON

Extempore on the autograph book of Miss Rose Marcus :—

You ask me to write
An English verse, and that too bright
That, I am afraid I cannot do
And therefore write one in Urdu:—

نظم لکھنے کا آپ کا کہنا — ہیں بسر و چشم سے بجا لاتا
پر کروں کیا کہ دل ہے افسردہ — گھر کے چھٹنے کا ابھی ہے غم تازہ
ہاتھ شل کر رہی ہے یہ سردی — دل کی حالت بھی کچھ نہیں اچھی
جب رہونگا یہاں میں کچھ دن اور — ہونگے تبدیل شاید اپنے طور
دل کو الفت کسی کی گرمائے — ہاتھ پیروں میں جان آجائے
سر میں سودا ہو زلف پیچاں کا — ہاتھ کنگن بیان جاناں کا
نظم تب دل لگا کے میں لکھوں — اپنے تو دل کا حال کہہ جاؤں

۵۰۷۸۳

۱۹۴۴ء ۸۹۱ ۱۳۴۱

منشی ناظم ۲۸۶۸ مشیر حسین قدوائی

وارثی

DATE	NO.	DATE	N